علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم

طلوعِ اسلام

April 1940

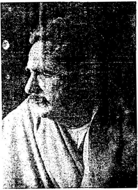

یادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

ضروری اعلان

شروع اپریل سے دفتر طلوع اسلام۔ بلّی ماران سے ذیل کے پتہ پر منتقل ہوگیا ہے چونکہ شروع شروع میں ڈاک خانہ والے جدید پتہ سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اسلیئے درخواست ہے، کہ جملہ خط وکتابت کے وقت ذیل کا پتہ پورا تحریر فرمائیں بہتر ہو کہ احتیاطاً ترسیل زر وغیرہ میں صرف "ناظم" کے بجائے "اخوندزادہ حسین امام" کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

جدید پتہ یہ ہے :۔ دفتر طلوع اسلام

شمیم منزل

شیدی پورہ۔ دہلی

المعلن

ناظم ادارہ طلوع اسلام

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

لالہ زارِ لاہور

میں

آغشتۂ خاک وخون شہدائے خاکساران

کی یاد میں

خون کے وہ چند آنسو جنہیں سرِ مژگاں تڑپ کر آجانیکے بعد اذنِ چکیدن نہیں

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

جگر فگار

ادارۂ طلوعِ اسلام

۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورجدید)

مرتب

اخوندزادہ حسین امام

جلد (۲) شمارہ (۴)

بدل اشتراک سالانہ پانچروپیہ -/5

ششماہی تین روپے -/3

صفر المظفر ۱۳۵۹ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

(۱) بیادِ شہدار	ادارہ	۱
(۲) فہرست مضامین		۲
(۳) مردِ مسلمان (نظم)	اسد صاحب ملتانی	۳
(۴) لمعات	ادارہ	۴ - ۲۴
(۵) شخصیت پرستی	چودہری غلام احمد صاحب پرویز	۲۵ - ۴۸
(۶) راشٹرپتی (مولانا آزاد)	ادارہ	۴۹ - ۸۴
(۷) نقد و نظر	ادارہ	۸۵ - ۸۸

مردِ مسلماں

یارب کہیں وہ مردِ مسلماں نظر آئے   جس میں اثرِ عظمتِ انساں نظر آئے
رکھتا ہو جو ہر بات میں اک شانِ خصوصی   اللہ کے بندوں میں نمایاں نظر آئے
جس کو نہ پڑے بھیس بدلنے کی ضرورت   خلوت میں بھی جلوت میں بھی یکساں نظر آئے
جس کے سخنِ حوصلہ افزا کے اثر سے   مُشکل کوئی کیسی بھی ہو آساں نظر آئے
وہ مرد کہ دشمن کی عداوت میں بھی جسکو   اللہ کی تائید کا ساماں نظر آئے

جس کے عملِ نیک میں پرتو ہو نبیؐ کا
جس کی نگہِ پاک میں قرآں نظر آئے

اسد ملتانی

لمعات

اللہ رے بساطِ سیاست کی فسونگرانہ مہرہ بازیاں! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی۔ وھایٹ ہال کے اربابِ حل و عقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک (لاہور) کی طرف لگ رہی تھیں رام گڈھ میں جمع ہونیوالے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف ہر تنہ کھنچے پر کھڑے ہوئے تھے انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خوابِ پریشاں بنتے نظر آرہے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں کہ جسکے حلقے انگریز کی ہوسِ استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جداگانہ قوم کے لیے ایک جداگانہ حکومت کے تصورات میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑنے والی تھی۔ سرزمین پنجاب کا ایک ایک ذرہ ابھر ابھر کر ۲۲ مارچ کے استقبال کے لیے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور لوکر ڈ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جانفزا بن رہا ہے غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتابِ تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں بشپرہ چشم غیروں کو اس آفتابِ جہاں تاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ خود اپنوں میں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کرتے تھے۔ جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے تحیر انگیز نتائج انکے چہروں کو بے نقاب کردینگے صفِ مخالف کی بھانپنے والی نگاہوں سے انکے چہروں کی اس اڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا اور ایک نرم ڈ

قاصد لاہور بھیجا گیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جس کی تفصیل کے متعلق کراماً کاتبین را ہم خبر نیست۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں گرم جوشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں آنیوالے منظر کا تصور نگاہوں میں چمک۔ قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیف طیب پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں۔ ولولوں نے کروٹ بدلی۔ ہمتیں آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں۔ عزائم نے قدم بڑھایا۔ ارادوں نے کمر ہمت باندھی۔ اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

اُدھر یہ گرمجوشیاں تھیں اور اِدھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے تبسم پنہاں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے جا رہے تھے۔ لیکن کیفِ عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس منظرِ پسِ پردہ کا جائزہ لے سے۔ وقت گزرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے۔ کہ عین شروع مارچ میں حکومت پنجاب کے قصرِ فلک بوس سے جماعتِ خاکساران پر پابندیاں عائد کرنے کے احکامات نافذ ہو گئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اسے بھی نہ سمجھا کہ

تیرے نشتر کی زد شریانِ قلبِ ناتواں تک ہے

مہینے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساران کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا کہ جلوس صدر مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے۔ شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف واکنافِ ہند میں دوڑ گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلا دی گئی ہے۔ تمام شہر ماتم کدہ بنگیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہو گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قایم ہو گیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر متنفس متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر۔ نہ بھائی کو بھائی کا علم۔ کاروبار بند۔ دل پژمردہ۔ ہمتیں پست۔ ولولے افسردہ۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ اور لاہور کی یہ حالت۔ شریک ہونیوالوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے۔ کچھ ٹکٹ بدست۔ اسٹیشنوں پر بیٹھے۔ کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لیے ٹھہرے ہوئے۔ ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا ہر ایک پریشان کہ اب کیا ہے گا۔ صدر جلسہ دہلی میں ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پہ تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہے ہیں

کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا۔ انھیں نہایت "مخلصانہ" مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور وحشت کے بے سامان ایک طرف۔ اور وہ عزم و ہمت کا پیکر ایک طرف کہ نامساعدتِ حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں اور اس روشنی کے بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقع کم ہی آیا ہوگا۔ اس تدبر و استقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا۔ لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اسکا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اسکے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔ اسنے اِن تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا اور ۲۰ کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق۔ بلا رد و بدل ہوگا۔ البتہ اِس حادثۂ الم انگیز کے پیشِ نظر کہ جسنے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا ہے جلوس نہیں نکالا جائیگا۔ اس اعلان کے سگھنٹے بعد یہ پیکرِ عزم و استقلال حسبِ انتظاماتِ سابقہ اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازمِ لاہور ہو گیا۔

لاہور پہونچکر قائدِ ملت نے کیا دیکھا یہ تو ان کی چشمِ پُرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جنکے ایک ایک قطرہ میں سینکڑوں قیامتیں تڑپتی نظر آ رہی تھیں۔ البتہ دوسروں نے جو کچھ دیکھا۔ اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ گویا ایک فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لیے لوگ اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے جانبِ قبرستان لیے جا رہے ہیں۔ چہرے اداس۔ دل پژمردہ۔ آنکھوں میں آنسو۔ شہر میں ہو کا عالم۔ ہر شخص ایک غیر محسوس خوف سے ہراساں سینوں میں آہ و فغاں کا قیامت خیز تلاطم۔ لیکن حلق "قانونی" پابندیوں کی ریشمین رسیوں میں جکڑا ہوا۔ دل الم جانگداز کی آتشِ خاموش سے سوختہ۔ لیکن لب "آئینی" قیود کی مصلحانہ بندش سے سربمہر کہ دھواں تک نہ نکلنے پائے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا پاس چلا بھی گیا تو ادھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اس کی چشمِ حیرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو چپکے چپکے اسکے غم و الم کی داستانِ خموش کا ایک

ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیل خانہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاں کا ذرّہ ذرّہ ایک مستقل پاسبان ہو۔ ادھر ادھر استقبال کے دروازے۔ نیم تیاریوں کی حالت میں۔ دو دن پیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں، گری ہوئی جھنڈیاں۔ ٹوٹے ہوئے قطعات۔ یوں ادھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانے والے مکانات کے بقیہ آثار۔ کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز۔ دو دن کے لٹے ہوئے سہاگ کی داستان الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی ہے۔ کسی گھر سے ضعف و نقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانے کی فریاد بنکر کنگورۂ عرش کو ہلانے جا رہی ہے۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اسکے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے۔ کسی گوشے سے زخمیوں کے کراہنے کی صدائے دردناک اِس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ ان کے لیے کس قدر ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ شہیدِ خاکساران کی خاک کے ذرات بیگناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگیں تھا بظاہر مرنے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ان سب کے ساتھ۔ شاہی مسجد کے جنوبی مینارے کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے۔ غلطیدہ خاک و خون۔ مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی اور ہوسِ خون آشامی کا شکار بنکر ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ بحضورِ رب ذوالانتقام دست بدعا ایستادہ کہ اے خدائے رؤف و رحیم! صدقہ اُس مردِ قلندرؒ کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محوِ خواب ہے۔ سرزمین لاہور کو غرق ہونے سے بچالے۔ کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن کی کفش بوسی کی سعادت حاصل ہے جسنے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا۔

ہاں یہ تھا لاہور اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا۔ کہ ایک مردِ مخلص کا یقین محکم و عمل پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموّج پیدا کر سکتا ہے اسکا نتیجہ جنوں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں

کے دلآویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے اس کا حسنِ تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حسن و خوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ ۲۱ مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں اس مردِ مخلص نے اگر صرف اتنا ہی کہا کہ :۔

"میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑوں ۔ اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آرہا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے۔ لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ۔ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری پوری دادرسی ہوگی حق و انصاف کا بول بالا ہوگا۔"

کہنے والے نے کچھ ایسا ہی کہا۔ لیکن سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدہ لاہور پر نور کی کرنیں بن کر برسے جنہوں نے یاس و حزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاع امید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سر نو کچھ روشنی پیدا ہوگی۔ افسردہ چہروں پر خونِ نو کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر کر سطح پر دکھائی دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد کرفیو آرڈر کے انسانیت سوز بھیانک عفریت کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں منتشر دکھائی دینے لگے اجتماعات پر جو پابندیاں عائد ہو چکی تھیں ان کی رسیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ شہر والوں کے دلوں سے پھر سے خوف و ہراس کے تپ دق کے جراثیم دور ہوئے قبرستان کے سے خاموش گلی کوچے پھر سے زندہ انسانوں کی بستیاں معلوم ہونے لگیں۔ پنڈال کی رونق بڑھی۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرے دن (۲۲ مارچ) بعد دوپہر کے پہلے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہ نواز خاں صاحب۔ صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسبِ دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا۔ لیکن قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا۔ کہ اس میں سے وہ حصہ خارج کر دیا جائے۔ جو خواہ مخواہ مسرود بر متان یاد دہانی بن جائے گا۔ پڑھتے پڑھتے حکومتِ پنجاب کے "درخشندہ" کارناموں کا ذکر آیا تو ۱۹ مارچ کے حادثہ محزنہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین و لعنت کے نہ تھکنے والے

نعروں سے گونج اٹھا مسلمانانِ لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا۔ آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آ گئے۔ مغموم دلوں کی وہ آتشِ خموش جو اتنے دنوں سے باہیں ضبط اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اسکا دُھواں تک بھی اوپر نہ اُٹھنے پائے۔ اسوقت اپنی پوری عنانی سے بھڑک اٹھی۔ یہ مظاہرہ محض رسمی نہ تھا۔ کہ حلق کے اوپر سے آوازیں اُٹھ رہی ہوں۔ یہ تو عمقِ قلب سے نکلی ہوئی آہیں تھیں۔ جنہیں سُنکر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سب کچھ سامنے تھا۔ اور چشمِ فلک عبرت و موعظت کے اِس دل دوز منظر کو حیران و ششدر دیکھ رہی تھی کہ اللہ اکبر! یہ کیا انقلاب ہے؟ اِس کے بعد ہوا کا رُخ بدل گیا۔ اِس خوف و ہراس کا ردِ عمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا۔ پورے جوش و خروش کی صورت میں رونما ہوا۔ گوشے گوشے سے "مردہ باد" کے نعرے سُنائی دینے لگے۔ گلی کوچے سے لعنت و ملامت کی آوازیں اُٹھنی شروع ہو گئیں۔ اسکا انتظام تو کر لیا جا سکتا تھا۔ کہ یہ چیزیں لاہور سے باہر کی دُنیا تک نہ جانے پائیں لیکن اِس کا کیا علاج کہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں نے اِن باتوں کو اپنے کانوں سے سُنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اِس کے بعد تو رنگ ہی بدل گیا۔ کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نفرت کے وملامت کے نعرے بلند نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اجتماع ایسا نہ تھا۔ جس میں خونِ شہدا کی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ سب جکٹ کمیٹی میں پانچ پانچ گھنٹے تک بحث رہی تو اسی مسئلہ پر۔ کھلے اجلاس میں ہر دس منٹ کے بعد تقاضا ہوا تو اسکا دو دن تک یہ ہی مطالبہ ہر شخص کی زبان پر تھا اس ہنگامۂ بحث و جدل اُس سیلاب جوش و خروش میں سٹر جناح نے جس ہمت۔ استقلال۔ عزم راسخ تدبر۔ صلاحیتِ ضبط و انضباط کا ثبوت دیا۔ آنے والا مورخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تامل پکار اُٹھے گا کہ فی الواقعہ ایک "قائدِ اعظم" کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا "رہبر فرزانہ" ملجائے اور مستحق صد تحسین ہے۔ وہ انسان جسے مبدء فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہو جائیں۔ کامل دو دن تک یہ ہی ہنگامہ رہا۔ اور بالآخر ۲۴ کی شب۔ آخری کھلے اجلاس میں، جب کہ پنڈال میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع ہو گا۔ مجمع کیا۔ جوش و جذبات کا بحرِ متموج تھا۔ جو ہر

متصادم عنصر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لیے کف بردہان موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثۂ فاجعہ کے متعلق رزولیوشن پیش کرنا اسی صاحبِ ہمت۔ مردِ دانا کا کام تھا۔ جسے اللہ نے اس پیرانہ سالی میں وہ جرأت و حوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرما دے صاحبِ صدر نے اس رزولیوشن کو پیش کیا اور اس درد و اثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ جسکے لفظ لفظ سے اسکے قلبِ محزوں کی تڑپ و خلش اُبلتی نظر آرہی تھی۔ رزولیوشن پیش کیا۔ اور ایک لاکھ کے مجمع میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اسکی مخالفت میں ایک آواز بھی اٹھائی ہو۔ صاحبِ صدر نے پوچھا۔ کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اسپر کھلے اجلاس میں بحث و تمحیص ہو لیکن سب نے کہہ دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی راہ نما پر کس قدر اعتماد ہے۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

لیگ کے اجلاس کی ابتدا اور اختتام میں کیفیات و جذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری پیدا ہو چکی ہے اور مسٹر جناح کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہے لاہور کا حادثہ ہر دیدۂ بینا کو خون کے آنسو رُلا دینے کا موجب تھا۔ بایں ہمہ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں ایک خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو نہ مسلمانوں کے ضبط و انضباط کا امتحان ہو سکتا۔ نہ مسٹر جناح کی بلندیٔ مرتبت کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکتا نہ لوگوں کو اس حد تک محسوس ہو سکتا کہ مسلم لیگ ان کے مفاد کی کس درجہ محافظ ہے اور نہ ہی لیگ اور خاکسار ایک دوسرے سے اسقدر قریب آسکتے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس آخری شق میں استقامت پیدا ہو جائے تو شہدائے لاہور کی قربانی رائگاں نہ گئی۔ ربنا الف بینا قلوبنا واجعلنا بنعمتک اخوانا

خاکساروں سے متعلق جو رزولیوشن پاس کیا گیا ہے وہ یقیناً اطمینان بخش ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ایک جزو سے تھوڑا سا اختلاف ضرور تھا۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ اگر حکومت سے یہ مطالبہ کرنے کے بجائے کہ وہ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرے۔ مسلم لیگ خود ایک آزادانہ تحقیقاتی

کمیٹی مقرر کرتی۔ اور لیگ کی مجلس عاملہ اس کمیٹی کی رپورٹ پر ضروری مواخذہ کرتی۔ بہرحال جو کچھ اجلاس نے منظور کیا۔ وہ مسلمانوں کے اجماع کا متفقہ فیصلہ ہے۔ جس کے بعد ہمیں اختلاف کا حق حاصل نہیں رہتا۔ اب ہم اربابِ لیگ کی خدمت میں اتنا عرض کریں گے کہ وہ اس معاملہ کو اختتام تک پہونچا کر اطمینان کی سانس لے۔ یونہی ادھورا نہ چھوڑ دے۔ اور اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت وغیرہ کا کام بھی صرف خاکساران۔ یا دیگر متعلقہ اشخاص کے ذمہ ہی نہ چھوڑ دے بلکہ اس میں خود بھی مدد کرے۔ لیگ کے اربابِ بست وکشاد کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ملتِ اسلامیہ کی فلاح وبہبود کی خاطر اُن کی صد سالہ نرم وگرم کوششیں ایک طرف اور ایک بیگناہ مسلمان کا خونِ ناحق ایک طرف۔ خونِ ناحق کا پلڑا پھر بھی جھکتا رہے گا کہ۔

من قتل مومنا متعمداً فجزاءہ جہنم خالداً فیھا ابداً

(جسنے کسی ایک مسلمان کو بھی عمداً قتل کر دیا اسکی سزا جہنم ابدی ہے۔)

ان کے اس خدا کا فیصلہ ہے جو تمام اعمالِ انسانی کا صحیح صحیح جائزہ لینے والا ہے۔

اس ضمن میں ہمیں کچھ ضروری باتیں اپنے خاکسار بھائیوں سے بھی کہنی ہیں لیکن وہ ابھی نہیں۔ آپ جیسے کہ میت والے گھر میں یہ کہنا کہ علاج میں فلاں نقص رہ گیا۔ انکے زخمی دلوں پر نمک پاشی کرنے کے مرادف ہے۔ زخم بھر جانے دیجئے۔ حالات درست ہو جانے دیجئے۔ یہ گذارشات پھر بھی کیجا سکینگی اسوقت سب سے مقدم تو اُن بے گناہوں کے خون کا مسئلہ ہے جس کی دیت تمام ملتِ اسلامیہ کے ذمہ لازم آتی ہے۔ آج جس شخص نے اس خونِ ناحق کے خون بہا دلانے میں ذرا بھی کوتاہی کی کسی قسم کی مصلحت کوشی نے اُسکے دامنِ عدل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ہمارے نزدیک اس میں اور ان ہاتھوں میں کوئی فرق نہیں جو ان شہیدوں کے خون سے رنگین ہیں۔ کسے باشد۔

خاکسار شہیدو! پہ اللہ کی رحمت ہو۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا جو ۱۹ مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی۔ لیکن مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اہمیت صرف اسلئے نہیں کہ اسمیں اس قیامت خیز سانحہ کے نتائج و عواقب کو اس حسن و خوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشم خویش دیکھا ہے وہ محسوس کریں گے کہ انہوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری کی تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک فلم تھا۔ جس میں پہلے یہ دکھایا گیا کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے تو اس پر کس قدر افسردگی چھا جاتی ہے اسکے قوائے عملیہ کس قدر مضمحل ہو چکتے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے کس قدر حزن و یاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اسکے بعد جب اس قوم میں ایک رہبر فرزانہ پیدا ہو جائے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضا کو بدل کر قوم کے عروقِ مُردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اسکے سامنے پروگرام کیا ہے اسکی تگ و دو کا منتہی کیا ہے اسکے سامنے نصب العین کون سا ہے! لاہور کے اجلاس نے واضح اور مبین الفاظ میں بتا دیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آرہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں دوسرے حصہ ملک سے الگ کر کے۔ ایک جداگانہ انداز حکومت قائم کیا جائے۔ صدر مسلم لیگ۔ مسٹر جناح۔ گزشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اُٹھاتے چلے آرہے تھے۔ دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ ان کی منزلِ مقصود کیا ہے! حتیٰ کہ ہم نے مارچ کے پرچہ میں مسٹر جناح کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ اس میں اس منزل کا پتہ نشان بھی کھلے کھلے الفاظ میں بتا دیا تھا۔ پہلے انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمان ایک اقلیت یا فرقہ نہیں۔ بلکہ ایک مستقل بالذات جداگانہ قوم ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہندوستان ایک واحد ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک ہے۔ پھر اور آگے بڑھے تو ارشاد فرمایا۔ کہ مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت مسلمانانِ ہند کے نزدیک قطعاً قابل قبول نہیں۔ جب یوں آہستہ آہستہ زمین تیار ہو گئی۔ جب قوم نے

ایک مرکب کے مختلف عناصرِ ترکیبی کو یوں الگ الگ دیکھ لیا تو اسکے بعد ۲۲ مارچ کی سہ پہر اپنے خطبۂ صدارت میں اور اسکے بعد ۲۳ مارچ کے کھلے اجلاس میں ایک رزولیوشن کے ذریعہ اس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کر دیا کہ مسلمانانِ ہند کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ان علاقوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے اپنی آزاد اور جداگانہ حکومت قایم کرینگے جہاں نہ انگریز کا عمل دخل ہوگا نہ ہندو کا اثر و تسلط۔ جب ایک واضح اور درخشندہ نصب العین سامنے آجاتا ہے تو اسوقت قوم کے دلوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ الفاظ میں نہیں سمجھایا جاسکتا۔ اسکا اندازہ تو اس پنڈال سے لگ سکتا تھا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ فی الواقع مسلمان ایک نئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اِس اعلان نے مسلمانانِ ہند کے تصورات کی دُنیا کو بدل دیا۔ اُن کے احساسات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہندوستان میں ان کی نشاۃِ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھ دیا ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم !
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

ذرا مارچ کے طلوعِ اسلام کو اُٹھایئے۔ اور "صبحِ اُمید" کے عنوان سے ہم نے جو کچھ لکھا تھا اُسے ایک بار پھر پڑھیئے اور دیکھیئے کہ حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۰ء میں جو کچھ فرمایا تھا۔ کامل دس برس تک اِدھر اُدھر چکر کاٹنے کے بعد ملتِ اسلامیہ کو وہیں جانا پڑا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ کوئی اور منزل مقصود ہی نہ تھی۔ یہ ہے فرق دانشِ نورانی اور دانشِ بُرہانی میں۔ انہوں نے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم سے طلب کیا۔ اور اللہ کی اس کتابِ مبین نے انہیں وہ حل بتایا جو فطرت کے قوانین کی طرح اٹل اور غیر متبدل تھا۔ دُنیا جہاں جی چاہے صحرا نوردی اور دشت پیمائی کرتی پھرے آ بالآخر ہار تھک کر قرآن ہی کی طرف آنا ہوگا۔ جتنی جلدی آجائے اتنی ہی مفت کی پریشانیوں سے بچ جائے اور بڑی خوشی یہ تھی کہ ملتِ اسلامیہ نے اپنے نصب العین کے متعلق یہ اعلان اسی مردِ حق آگاہ کے راحت کدہ کے سرہانے جاکر کیا ؎

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد ؞ چشم خود بربست و چشم ما کشاد

ہمیں افسوس اتنا ہوا کہ سوائے ایک ڈاکٹر محمدؐ عالم کے اور، کسی نے اِس امر کا اعتراف بھی نہ کیا کہ نظریہ جسے ہم ملتِ اسلامیہ کا نصب العین قرار دے رہے ہیں۔ اسکا سرچشمہ کون سا ہے، یہ کس مردِ خود آگاہ و خدا مست کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے۔ یہ کس مردِ قلندر کی آہ نیم شبی و نالہ سحری کا رہینِ منت ہے۔ قوم اگر اسکا اعتراف کرتی تو خود قوم کے لیے باعثِ صد افتخار ہوتا اسلئے کہ وہ "مردِ مومن" تو اس قسم کی مدح وستایش سے مستغنی تھا۔ اسنے کبھی زندگی میں اس کی خواہش نہ کی تو بھلا مرنے کے بعد اسے اس کی کیا ضرورت ہے اسکا مقام ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے البتہ قوم اپنی احسان شناسی اور کشادہ ظرفی کا ثبوت دیتی لیکن یہ مسلمانوں کی قوم ہے۔ یہ صرف کفر کے فتوٰے ہی لگانا جانتی ہے!

اسی مقام پر ایک اور چیز بھی یاد آگئی۔ اربابِ مسلم لیگ کے متعلق بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے، کہ یہ لوگ قرآن سے قطعاً نا آشنا اور لاعلم ہیں اس لیے ان کی حمایت و تائید کس طرح جائز قرار پا سکتی ہے؟ ہم نے اپنے مسلک کی وضاحت میں کئی بار اس امر کی تصریح کی ہے کہ ہمیں بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ یہ لوگ علومِ قرآنی سے واقف نہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کا اصولی مسلک اصول قرآن کے مطابق ہے۔ اسلئے ہم اس مسلک کی تائید ضروری سمجھتے ہیں۔ جسوقت اسمیں کوئی چیز ایسی آجائے گی دانستہ یا نادانستہ جو قرآن کے خلاف ہوگی۔ سب سے پہلے ہم ہوں گے۔ جو اس کی مخالفت کرینگے ہمارے اس مسلک کی تائید لیگ کے اس اجلاس سے بھی ہو رہی تھی۔ جو رزولیوشن لیگ نے پاس کیا۔ وہ کونسا مسلمان ہے جو کہہ سکتا ہے کہ وہ تعلیمِ قرآنی کے مطابق نہیں۔ لیکن اس رزولیوشن کی تائید میں جس قدر دلائل پیش کیے گئے، وہ تمام آئینی و سیاسی تھے۔ قرآنی نہیں تھے۔ معترض کہے گا کہ دیکھئے لیگ کے تین دن کے اجلاس میں ایک دلیل بھی "نصوص قرآنی" سے نہیں دی گئی۔ اس لیئے اس جماعت کی مخالفت ضروری ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس تین دن کی بحث وتمحیص کے بعد لیگ نے جو نصب العین متعین کیا۔ اسے دیکھئے۔ وہ عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ لہٰذا اس مسلک کی تائید کیجیے۔ اب یہ بتانا کہ یہ مسلک کس طرح قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ ہمارا فریضہ ہے۔ یہ خوب ہوتا اگر خود لیگ کے ارباب

حل وعقد اس مسلک کو پیش کرتے وقت ہمیں یہ بتاتے کہ دیکھئے یہ مسلک کس طرح قرآنی اصولوں کے مطابق ہے۔ لیکن جب حالت یہ ہو گئی ہو کہ قرآنی اصولوں کو جاننے والے علماء اپنی دونوں رام گڑھ میں متحدہ قومیت کے سے غیر قرآنی نظریہ کو عین اسلام بتا رہے ہوں تو غنیمت سمجھئے کہ یہ قرآن نہ جاننے والے مسلمان وہ مسلک پیش کر رہے ہیں جو قرآن کے مطابق ہے۔ یہ مسلک کس طرح قرآن کے مطابق ہے۔ اس کے خلاف جو اعتراضات عائد کئے جاتے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اسکیم کس طرح قابل عمل ہے! اس سے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ مسلم انڈیا میں غیر مسلم اقلیتوں کی کیا حالت ہو گی! یہ تمام سوالات ایسے ہیں جن کے تفصیلی جواب کا یہ موقعہ نہیں۔ ان کے متعلق ہم دوسری اشاعت میں شرح وبسط سے بحث کریں گے۔ انشاء اللہ۔

ہاں! تو لیگ نے اس رزولیوشن سے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک نئی زندگی کا دروازہ کھول دیا۔ اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کا نصب العین۔ یقیناً ایک نئی زندگی کی تمہید ہے۔ اس امر کی مخالفت اگر کہیں سے ہو سکتی تھی تو اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی طرف سے ہو سکتی تھی۔ لیکن ان صوبوں کے مسلمان نمائندوں نے جس وسعت اور کشادگیٔ قلب سے اس رزولیوشن کی تائید کی وہ اس امر کا آئینہ دار تھا کہ مسلمان اب کس طرح اپنے انفرادی مصالح کو ملّت کے کلی مصالح پر قربان کر دینے پر بسر وچشم آمادہ ہے۔ ہم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو انکے اس طرز عمل پر درخور ہزار مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔ انہوں نے فی الواقع بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔ لیگ کے اس رزولیوشن کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمان جو اب تک لیگ کی مخالفت کرتے چلے آرہے ہیں۔ اب کس بنا پر اس کی مخالفت جاری رکھیں گے! لیگ کا نصب العین واضح ہو گیا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے اس نصب العین کی مخالفت کر سکتا ہے۔ اس وقت تک جو کچھ پریس میں آچکا ہے اس سے آپنے دیکھ لیا ہو گا کہ اس رزولیوشن نے ہندوؤں کو کس طرح آتش در پیرہن کر دیا ہے۔ مہاسبھائی، اور کانگرسی نرم اور گرم سب بیک زبان اس کی سخت سے سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا یہی امر اس چیز کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ یہ نصب العین کس طرح مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ اس حقیقت سے

کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے شیطان ناراض ہو۔ وہ یقیناً اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوا کرتی ہے تو اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے، کہ وہ کون لوگ ہیں جو مسلمان کہلواتے ہوئے اس باب میں غیر مسلموں کی تائید کرتے ہیں۔ حق و باطل کے امتیاز کی یہ کیسی عمدہ کسوٹی ہے! آیئے اور خود امتحان کر لیجیے۔

لیکن ایک چیز ابھی لیگ سے بھی کہنی باقی ہے۔ کہنے کو تو یہ رزولیوشن چند الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن درحقیقت یہ ایک کھلا ہوا اعلان جنگ ہے تمام غیر مسلم قوتوں کے خلاف! لہٰذا اس امر کا خوب اندازہ کر لینا چاہیے کہ اس نصب العین کے حصول کیلئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ یہ حکومت و سلطنت خریدنے کا سودا ہے اور اس جنسِ گراں مایہ کی قیمت میں ایک قوم کو اپنی عزیز ترین متاع قربان کرنی پڑا کرتی ہے۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

لہٰذا اب وہ وقت آچکا ہے کہ جو اس میدان میں آئے سر بکف اور کفن بدوش آئے! اللہ کی نصرت اسکے ساتھ ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ مسٹر جناح نے اپنی عمر میں سب سے پہلی مرتبہ اس امر کا اعلان کیا۔ کہ اب وہ نصب العین ہمارے سامنے آگیا جس کے حصول کی خاطر میں اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار ہوں لیگ کے علاوہ وہ اسلامی انجمنیں جو اس نظریہ کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں ہم ان کی خدمت میں بھی گزارش کریں گے۔ کہ اب انھیں اپنی جماعتوں کو الگ الگ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ان تمام جماعتوں کو لیگ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے بلکہ لیگ ہی میں مدغم کر دیا جائے۔ اور یوں تمام ذرات سمٹ کر چٹان بن جائیں کہ وقت بڑا نازک ہے اور مرحلہ سخت دشوار ہمیں اس امر کا بھی احساس ہے کہ لیگ کا موجودہ رزولیوشن ہمارے بعض انتہا پسند نوجوانوں کے معیار سے ابھی نیچے ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ لیگ نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ تو اسی طرف جاتا ہے جو آپ کی منزل ہے۔ لیگ کا نصب العین آپ کی منزل سے ایک قدم پیچھے سہی۔ لیکن جب تک آپ اس منزل تک نہ پہونچیں گے اگلی منزل کس طرح سامنے آئیگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اور تو اور، لیگ کا یہ رزولیوشن خود ہمارے نصب العین سے بھی ایک قدم پیچھے ہے۔ لیگ کے سامنے سر دست آئینی انقلاب ہے! اور ہم خالص حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے حامی ہیں۔ لیکن ہمارے نصب العین تک پہونچنے کے لئے بھی

یہ راستہ کی منازل ضروری ہیں۔ لہٰذا اسوقت سب سے پہلا کام لیگ کے مجوزہ نصب العین کا حصول ہے۔ اسکے بعد آگے قدم اُٹھایا جائیگا جو اعتراض آپ کے دل میں اسوقت موجزن ہے اسکا اندازہ ہم آپکی پیشانی سے کر رہے ہیں لیکن یقین مانئے کہ جب آپ سب کے سب لیگ میں آجائینگے۔ اور لیگ اپنے اس نصب العین کے حصول میں کامیاب ہو جائیگی۔ تو پھر وہ کچھ کبھی نہیں ہوگا جو آج پنجاب میں ہو رہا ہے۔ پھر مسلمانوں کا خون اس طرح پانی کی طرح ارزاں نہیں ہوگا۔ یہ تو سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے۔ کہ آپ حضرات ساتھ شامل نہیں ہیں۔ چراغ کے نہ ہونے کا نام اندھیرا ہے۔ چراغ لے آیئے۔ اندھیرے کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ باقی نہ رہے۔ ان الباطل کان زھوقا۔ آپ آیئے اور لیگ میں شامل ہو کر اسے تقویت دیجئے۔ اسکے بعد آپ دیکھیں گے کہ ؎

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری ٭ نہ دارائی ماند نہ اسکندری ٭

کیا آپنے نہیں دیکھا کہ آپ نے لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے میں تھوڑی سی کوشش کی اور آپ کے اس اجتماعی عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور کی پوری فضا دو دن میں بدل گئی۔ ذرا سی متفقہ حرکت سے پنجۂ استبداد کی گرفت بالکل ڈھیلی ہو گئی۔ وہ آئین خصوصی جو شہر پر بھیانک دیو کی طرح مسلط ہو رہے تھے۔ ایک ایک کر کے اُٹھ گئے۔ وہاں کی پولس اور پولس کی آتشبار بندوقیں سب دھری کی دھری رہ گئیں حکومت اور حکومت کی قہرمانی قوتیں سب سرنگوں ہو گئیں یہ کیا تھا؟ سب اسی اجتماعی یک جہتی کا نتیجہ جسکا مظاہرہ آپنے لیگ کے پنڈال میں کیا۔ اور یہ تو وقتی مظاہرہ تھا۔ آپ مستقل طور پر اسی قسم کی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کر لیں تو پھر دیکھیں کہ باقی وہی رہیگا جو دیانت و خلوص سے آپ کے ساتھ ہوگا اور سب فنا ہو جائینگے۔

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست ٭ تا یکے اندر قیام آئی فناست

ان دو رزولیوشنز کے علاوہ تیسرا رزولیوشن مسئلہ فلسطین کے متعلق تھا اور بین الاقوامی حالات پیشِ نظر مسلمانانِ ہند کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں جس

چیز کا احساس نہایت شدت کے ساتھ سامنے آتا رہا وہ اسلامی پریس کا قیام تھا۔ یوں تو اپنے پریس کا وجود ہر حالت میں ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن ایسے ایسے نازک مواقع پر یہ ضرورت اور بھی اہمیت اختیار کر لیتی ہے پنجاب کا پریس کچھ تو پہلے ہی "ہز ماسٹرز وائس" بن رہا تھا اس کا رہا سہا گلا آئینِ خصوصی کے پنجۂ استبداد نے گھونٹ دیا۔ نتیجہ یہ کہ باہر کی دُنیا کو بہت کم معلوم ہو سکا کہ ان دنوں لاہور میں کیا کچھ ہو گیا اگر لیگ کا اپنا آزاد پریس ہوتا تو یہ مشکلات کیوں پیش آتیں لیکن خدا کرے کہ یہ پریس پنجاب سے باہر قایم ہو۔ کیونکہ پنجاب کی فضا آزاد پریس کے لیے سازگار نہیں ہے ۔

لاہور میں انہی دنوں اور بہت سے اجتماعات ہوئے۔ لیکن ان میں ہمارے نزدیک قابل ذکر تیسرا یوم اقبالؒ ہے جو مرکزی اقبال ڈے کمیٹی کے زیر اہتمام یونیورسٹی ہال میں ۲۴ اور ۲۵ مارچ کو منایا گیا۔ یہ تقریب ہر لحاظ سے کامیاب تھی۔ اللہ تعالیٰ انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے کارکنان کے ارادوں میں برکات اور ہمتوں میں فراوانی عطا فرمائے کہ ان کی سعی و کاوش سے ہر سال حضرت علامہؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ورنہ مسلمانوں جیسی قدر ناشناس قوم میں تو اتنی بھی توفیق نظر نہ آتی تھی ہم اپنے محترم و کرم فرما جناب پرویز صاحب کے دلی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے یوم اقبالؒ کے سلسلہ میں اپنی تقریر اور پیغام بغرض اشاعت ہمیں مرحمت فرما دیا جو کسی آئندہ پرچے میں شائع ہونگے۔ جناب پرویز نے شروع ہی سے جس کشادہ ظرفی سے طلوع اسلام کو اپنے رشحاتِ قلم کی گہر باریوں کا دامن خصوصی قرار دے رکھا ہے ہمیں اس کی سپاس گزاری کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ اور ہم اپنی اس تہی مائیگی کو ہمیشہ اس اطمینان سے چھپا لیتے ہیں کہ ان کی نگاہیں بھی ہمارے الفاظ پر نہیں بلکہ اس دل پر ہوتی ہیں جو ان الفاظ کا سرچشمہ ہے ۔

طلوع اسلام کا ذکر آگیا، تو اس اسٹال کا ذکر بھی ضروری سمجھا گیا جو حسبِ اعلان، لیگ کے پنڈال سے باہر نصب کیا گیا تھا۔ اس تجویز سے ہمارا مقصد پمفلٹوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ کرم فرمایان طلوع اسلام سے ذاتی متعارف ہونا تھا۔ اور شکر ایزدی کہ اس باب میں ہم فائز المرام واپس لوٹے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی تھی کہ ہندوستان کے دُور دراز اور غیر معروف گوشوں کے لوگ آتے تھے۔ اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جو طلوعِ اسلام سے پہلے ہی واقف نہ ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا صدقہ ہے جو اُس مردِ مومن کی دعاؤں کے طفیل ہمارے حال پر ارزاں ہوا جس کی یاد طلوعِ اسلام کا مایۂ زندگی ہے۔ ہمارے لیے یہ امر باعثِ صد افتخار تھا کہ جو حضرات وہاں تشریف لاتے تھے، انہیں ادارہ سے محض ایک رسالہ کے خریدار کا سا تعلق ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو ادارہ کا ایک جزو سمجھتے تھے اور ادارہ کے ساتھ ان کا رشتہ رسمی کے بجائے یکسر قلبی تھا۔ وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

اسٹال پر ویسے بھی ہماری توقعات سے بڑھ چڑھ کر رونق رہی اور اس ہجوم میں ہمارے بعض احباب اگر ہمارا ہاتھ نہ بٹاتے تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا ہوتا۔ ہم اپنے ان دوستوں کی دست گیری کے لیے سراپا سپاس ہیں۔ بعض کتابیں اسٹال پر اتنی جلدی ختم ہو گئیں کہ ایک کثیر تعداد حضرات کو مایوس واپس جانا پڑا۔ ہم ان کی تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ بہت سے احباب اسٹال پر مختلف قسم کے آرڈر لکھ کر چھوڑ گئے۔ ان کی تعمیل آہستہ آہستہ ہو رہی ہے۔ اگر کسی صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں تاخیر ہو جائے یا تعمیل حسبِ منشا نہ ہو تو ہمیں مطلع فرمائیے گا۔ ایسے ہجوم میں مرتب کردہ یادداشتوں میں کچھ فروگذاشتیں مستبعد نہیں ہوتیں۔

لاہور میں ایک اور چیز بھی ہمارے علم میں آئی۔ بعض حضرات نے بتایا کہ طلوعِ اسلام کے پمفلٹ مختلف مقامات پر فروخت ہو رہے ہیں۔ ہم نے کسی دوسرے مقام پر اپنی ایجنسی نہیں رکھی۔ اس لیے معلوم ہوا کہ بعض "شکاری" قسم کے لوگ ان پمفلٹوں کو اپنے طور پر چھپوا کر فروخت کر رہے ہیں۔ ان کی یہ حرکت قانون اور اخلاق دونوں کی رُو سے قابلِ مواخذہ ہے۔ اس لیے ہم بہی خواہانِ طلوعِ اسلام سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں مطلع فرمائیں کہ اس کے پمفلٹ کہاں کہاں فروخت ہو رہے ہیں تاکہ ہم ضروری کارروائی کر سکیں۔ طلوعِ اسلام ایک تجارتی ادارہ نہیں لیکن اس قسم کی حرکات سے اس کے تبلیغی مقاصد کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ تو ظاہر ہے۔ اس لیے اس باب میں ہماری معاونت۔ تعاون بالخیر ہوگی۔

اسی پرچہ میں دوسری جگہ تبدیلی پتہ کا اعلان شائع ہو رہا ہے اسے غور سے دیکھ لیجیے گا۔

یہ پرچہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے اس تاخیر کا سبب مسلم لیگ کا اجلاس ہے، بایں ہمہ اس زحمتِ انتظار کے لیئے ہم سراپا معذرت ہیں جو اس تاخیر کی وجہ سے قارئین طلوعِ اسلام کو اُٹھانی پڑی +

پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ اخبارات سے اطلاع ملی کہ میرٹھ میں خاکساروں کے نمائندگان نے اپنے ایک اجتماعِ خصوصی میں جناب نواب بہادر یار جنگ صاحب کو اپنا امیر منتخب کر لیا ہے جناب نواب صاحب مستحقِ صد تبریک ہیں کہ انہیں ایسی زندہ جماعت کی امارت کے لیئے منتخب کیا گیا۔ اور جماعتِ خاکساران درخورِ ہزار تہنیت ہے کہ انہیں ایسا مخلص مُدبر قیادت کے لیئے مل گیا۔ بنی اسرائیل نے جب حضرت طالوت کے انتخابِ امارت پر اعتراض کیا تھا تو اُسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جو خوبیاں ایک امیرِ قوم میں ہونی چاہئیں وہ ان سب کا حامل ہے یعنی

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ ۲۴۷

وہ دماغی اور جسمانی دونوں اعتبار سے توانا ہے

جناب نواب صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے اِن دو خصوصیتوں کا حامل بنایا ہے۔ اور ہمیں کامل اُمید ہے کہ اُنکے زیرِ قیادت تحریکِ خاکساران اپنے نصب العین کی طرف رواں دواں بڑھتی جائیگی اور وہ دن دُور نہیں جب ہم دیکھیں گے کہ سپاہیانِ ملّت کی یہ مخلص جماعت مسلم لیگ کا عسکری بازو بنکر حکومتِ الٰہیّہ کے قیام و استحکام میں کالبنیان مرصوص متمکن ہو جائیگی۔ اسلیئے کہ جناب نواب صاحب کی بصیرتِ قرآنی اور مسٹر جناح کی دانشِ برہانی اس امر سے خوب آگاہ ہے کہ تکمیلِ دین کے لیئے شمشیر و قرآن کا یکجا ہونا ضروری ہے

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

ہمارا خیال ہے کہ جناب نواب صاحب کی قیادت کے بعد ہمیں شاید خاکساروں کی خدمت میں وہ کچھ

عرض کرنیکی ضرورت باقی نہ رہے جس کا اشارہ ہم نے اپنے لمعات میں کیا ہے۔ جناب نواب صاحب کی انگلیاں نبضِ تحریک پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہیں اس لیئے وہ جماعت کے لیئے راہِ عمل تجویز کرنے میں کامل حزم و احتیاط اور تدبر و تفحص سے کام لیں گے جس سے مبداء فطرت نے انہیں بہرہ یاب کیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریک کے متعلق ایک پورا نقشہ تیار کیا جائے۔ جس میں ہر ایک مہرہ اپنے اپنے مقام اور فرائض سے پوری طرح واقف ہو۔ اور جانتا ہو کہ فلاں متوقع اور غیر متوقع سانحہ کے وقت مجھے کیا کرنا ہے۔ نیز اس امر کا بھی پورا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ یہ ہجوم جاں نثاران کسی وقت بھی "بے سری فوج" بن کر نہ رہ جائے اس امر کی بھی ضرورت ہے، کہ ہر خاکسار کے ذہن میں یہ نقش اچھی طرح مرتسم کر دیا جاوے۔ کہ اسکا نصب العینِ زندگی حکومتِ خداوندی کا قیام ہے اور اسکے لیئے اسے سب سے پہلے اپنے اندر ایک انقلاب پیدا کرنا ہے جب یہ اندرونی تنظیم حسبِ خاطر ہو جائے تو پھر انہیں بیرونی قوت سے خدشہ نہیں ہو سکتا

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اس ضمن میں ابھی ابھی اخبارات (اسٹیٹسمین مورخہ ۲۴ ۳۱) میں ایک بڑی دیدہ کشا خبر شائع ہوئی ہے۔ حکومت یوپی سے کہا گیا کہ پنجاب کی طرح آپ بھی جماعتِ خاکساران کو خلاف قانون قرار دیجیئے (غالباً حکومت پنجاب نے یہ درخواست کی ہوگی) انہوں نے جواب دیدیا کہ یونہی خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ایک پُر امن جماعت کو خلاف قانون کیوں قرار دیدیا جائے۔ ان بیچاروں نے کیا بگاڑا ہے۔ یہ کوئی شرارت نہیں کرتے۔ نقضِ امن کے درپے نہیں۔ اسلیئے ہم تو ایسے اقدام پر تیار نہیں ہیں

ہمارا خیال ہے کہ حکومت پنجاب کو اس جواب سے کچھ عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ پنجاب میں خاکساروں کی طرف سے کون سی قیامت برپا ہو رہی تھی۔ جو انہیں یوں پنجہ استبداد میں جکڑ دیا گیا۔ ۱۹ مارچ کے حادثہ محزنہ کے متعلق جو تحقیقاتی کمیٹی بٹھائی گئی ہے وہ صرف اتنی بات کی تحقیق کرے گی کہ اس حادثہ کے اسباب و عواقب کیا تھے۔ لیکن اصل تحقیق طلب بات تو یہ ہے کہ آیا حکومت پنجاب

جماعت خاکساران پر پابندیاں عائد کرنے میں بھی حق بجانب تھی! جہاں تک باہر کی دنیا کو علم ہے خاکساروں نے پنجاب میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے نقضِ امن کا اندیشہ ہوتا۔ پھر معلوم نہیں کہ ان کے خلاف جس اقدام کو یو۔پی کی "غیروں کی حکومت" حق بجانب نہیں سمجھتی اس اقدام کو پنجاب کی "اپنوں کی حکومت" نے کس طرح اتنا ضروری سمجھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک محشر برپا ہو جائے گا۔

اس کے متعلق دو قسم کی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ اوّل یہ کہ سر سکندر حیات خاں یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ پنجاب کے مسلمانوں میں مقبول ہو جائیں اور وہ خود اپنی من مانی کارروائیاں نہ کر سکیں۔ اس لئے مسلم لیگ کے اجلاس کو خراب کرنے کے لئے یہ کارروائی کی گئی۔ دوسرے یہ کہ ہندو اور سکھ وزیروں کی طرف سے جناب وزیرِ اعظم پر اس تحریک کے متعلق اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنی وزارت کے استحکام کی خاطر خاکساروں کی جماعت پر پابندیاں عائد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ صحیح واقعات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس آرائیاں کہاں تک درست ہیں۔ پہلے قیاس کے متعلق ہم لمعات کے شروع میں لکھ چکے ہیں اور ایسا باور کر لینے کی وجہ سے سر سکندر حیات خاں صاحب کی لیگ کے متعلق وہ "سنگ رے بود و ہر رنگ ستاں دلستیق" پالیسی ہے جو ہر صاحبِ نظر انسان کے سامنے ہے۔ اگرچہ اس قسم کے تصور سے بھی ہماری روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ سر سکندر حیات خاں جیسا صاحبِ فراست انسان اس حقیقت سے ناواقف ہو سکتا ہو کہ اب اس قسم کی کوئی حرکت مسلم لیگ کی مقبولیت کو نہیں روک سکتی۔ اور نہ ہی یہ یقین آتا ہے کہ وہ کسی ایسی حرکت سے اسلامی تاریخ میں اپنا نام میر جعفر اور میر صادق کے ساتھ لکھوانے کا خیال کر سکتے ہیں۔ بہر حال دلوں کا بھید تو خدا ہی جانتا ہے "انسان تو صرف قرائن سے نتائج مرتب کرتا ہے۔ واللّٰہ بصیرٌ بالعباد۔

دوسری چیز شقِ اول سے بھی زیادہ قرینِ قیاس نظر آتی ہے۔ یہ امر سکندر حیات خاں کی گذشتہ زندگی سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو خوش رکھنے اور غیروں میں مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر بعض دفعہ اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ خود اپنی جماعت اور اپنی قوم کیلئے باعثِ نقصان بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ خیال ستا رہا ہو کہ حزبِ مخالف اور خود اپنے مسلمان مخالفین کے ساتھ ساتھ اگر ہندو اور سکھ وزیروں کی مخالفت بھی شروع ہو گئی تو وہ پنجاب میں اپنی وزارت نہ قائم رکھ سکیں گے۔ لیکن اس کے متعلق ہم ان کی توجہ بنگال کے وزیرِ اعظم کی طرف دلانا

چاہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کا خیال رکھتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ بھی انصاف کرتے ہیں۔ لیکن ان کے جذبۂ خدمتِ ملّت کے راستہ میں کوئی دباؤ حائل نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مسلم بنگال میں اس قدر ہر دلعزیز ہیں کہ بنگال اسمبلی میں جب ان کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش ہوئی تو بنگال کا ایک لاکھ مسلمان بارش میں اسمبلی ہال کے باہر کئی گھنٹوں تک رات کے وقت متواتر نعرے لگاتا رہا۔ اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک انھیں یہ معلوم نہ ہوگیا کہ تحریک گر گئی ہے۔ اگر سر سکندر حیات خاں پر اغیار کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ کہ اگر وہ خاکسار تحریک کو نہ دبائینگے تو وہ وزارت کو متزلزل کر دینگے تو انھیں پوری جرأت ایمانی سے مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو خطرناک وقت آنیوالا ہے اس کے لئے خاکساروں جیسی جماعت کی کس قدر ضرورت ہے اور مخالفین کو وہی جواب دے سکتے تھے جو حکومت یوپی نے دیا ہے اور اگر اس کے باوجود اغیار اس بنا پر ان کی وزارت کو توڑنا چاہتے تو وہ دیکھتے کہ اگر بنگال کے مسلمان اپنے وزیرِ اعظم کی حمایت میں ایسا پر زور مظاہرہ کر سکتے تھے تو پنجاب کا بہادر اور غیور مسلمان بھی سر سکندر حیات خاں کے لئے اپنی جانیں تک حاضر کر دیتا۔ اگر اس بنا پر وزارت ٹوٹ بھی جاتی تو ہمیں یقین ہے کہ پنجاب کا مسلمان کوئی دوسری وزارت بھی عمل میں آنے دیتا۔ اور سر سکندر حیات خاں پنجاب اور ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں وہ جگہ پیدا کر لیتے کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں انہی کی ذات کی طرف لگ جاتیں۔ جس وزارت کے بچانے کی خاطر وہ اس قدر کمزوری دکھا رہے ہیں ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ انھیں آئندہ کی اسلامی تاریخ کے مقدمے پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔ اگر آج انھیں اسلام کی حفاظت اور اپنی قوم کی بہتری کے لئے وزارت سے بھی الگ ہونا پڑے تو یہ چیز ان کی عظمت میں اور اضافہ کرے گی۔

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیری بہ از صد سال میش (اقبالؒ)

ہمیں امید ہے کہ خاکساروں کا خون، ملّتِ اسلامیہ کی بہبود پر منتج ہوگا۔ سر سکندر آخر مسلمان ہیں اگر یہی جانگداز سانحہ سر سکندر کو صحیح مردِ مومن بنا کر سامنے لے آئے اور وہ خاکساروں کی تحریک سے نہ صرف پابندیاں ہٹا دیں بلکہ اعلان کر دیں کہ میری وزارت رہے یا نہ رہے۔ جب تک خاکسار پُر امن ہیں، ان پر کوئی پابندی عائد

نہیں ہوگی۔ تو آپ سمجھینگے کہ مسلمان جو بحیثیت قوم ان سے روٹھا ہوا ہے وہ انھیں اپنے سر آنکھوں پر بٹھائیگا۔ اس کے بعد مسندِ وزارت ان کے قبضے میں رہے یا جائے ملّتِ اسلامیہ انھیں شوکت و عظمت کے اس تختِ بلند پر فائز المرام کر دے گی جس کے پائے چوبیں آئینی انتخابات و دستوری آمار کی ریتلی بنیادوں پر نہیں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کی عقیدت و ارادت اور محبت و خلوص کی محکم چٹانوں پر نصب ہونگے اور پھر اس وقت ان کی یہ کیفیت ہوگی کہ ان کے اور ان کے خدا کے درمیان کوئی ایسی دوسری قوت حائل نہ ہوگی جس سے انھیں ڈرنا اور دبنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔ چہ عجب کہ وہ جناب سر سکندر کے سینہ کو کشادہ کرکے ان کے دل میں وہ جرأتِ ایمانی پیدا کر دے جس کی آج پنجاب کے مسلمانوں کو اس قدر ضرورت ہے

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

یہ تو تھا خاکساروں کے متعلق۔ لیکن لیگ کے متعلق سر سکندر حیات خاں صاحب کی روش اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ انہیں ایک عرصہ سے معلوم تھا کہ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ دستورِ اساسی کی مختلف اسکیمیں لیگ کے زیرِ نظر تھیں۔ بایں ہمہ شروع مارچ میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں ایک تقریر کے دوران میں طلباء کو ہدایت کی کہ وہ زندگی میں جونسا نصب العین چاہے اختیار کرلیں لیکن "علیحدگی" کے کسی نظریہ کی تائید نہ کریں۔ کیونکہ یہ نظریہ اسلام کی روح کے خلاف ہے (؟)۔ لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں مسلم انڈیا کو ہندو انڈیا سے الگ کردینے کا ریزولیشن پاس کر دیا۔ اور سر سکندر کی طرف سے اس کی تائید یا تردید میں ایک لفظ بھی شائع نہ ہوا اسکے بعد سر چھوٹو رام نے جاٹ کانفرنس (سونی پت) میں تقریر کرتے ہوئے نہایت یقین و اعتماد کے ساتھ اعلان کیا۔ کہ سر سکندر لیگ کی اس اسکیم کے مخالف ہیں۔ اور وہ کبھی "خالص اسلامی" حکومت میں وزیرِ اعظم بننا تو درکنار کوئی ذمہ داری کا عہدہ تک لینے کو تیار نہیں ہوں گے۔ دنیا منتظر رہی کہ سر سکندر حیات خاں اب کیا فرماتے ہیں۔ لیکن سر سکندر کچھ ایسا گونگے کا گڑ کھائے ہیں۔ کہ ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالتے۔ اس کے بعد سوائے اس کے اور کیا کہا جائے۔ کہ اللہ ہماری حالت پر رحم کرے۔

(مورخہ ۵ اپریل)

شخصیت پرستی

(۲)

جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز

رواۃ پرستی اِس مضمون کی قسطِ اوّل میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کا نصب العین تو یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا کردے لیکن بعد میں مسلمانوں نے کس طرح اپنے اور اپنے خدا کے درمیان مختلف حاجب و دربان معتبر کرلیے اور دین کے معاملہ میں براہِ راست خدا تک پہونچنے کے بجائے راستہ میں "ارباب من دون اللہ" کا دامن تھام کر بیٹھ گئے۔ اِس سلسلہ کی پچھلی کڑی میں اس کورانہ تقلید کا ذکر آیا تھا جو ائمہ پرستی کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہوگئی۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر اِس جامد تقلید کی خرابیوں کا احساس نمودار ہوا اور ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اسکی شکست و ریخت کے لیئے ہاتھ اُٹھائے۔ یہ کوشش بڑی مبارک تھی لیکن شاید ابھی مسلمانوں کے ابتلاء کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اِسلیئے اُنکے ساتھ بھی یہی ہوا کہ

خواستم پیکاں برآرم۔ در جگر نشتر شکست !

ائمہ پرستی کے کانٹوں سے دامن چھڑانے گئے تھے لیکن خود ایک اور جھاڑی میں اُلجھ کر رہ گئے۔ یہ "جھاڑی" عقیدت و ارادت کے اِسقدر خوشنما اور نظر فریب پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے کہ دامن کو اُلجھانے والے کانٹوں کو بے نقاب دیکھنا بڑا وقت طلب ہے۔ اِسلیئے جو کچھ اِس حصۂ مضمون میں عرض کیا جائیگا اُسے پوری طرح سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ آپ اِن خیالات کو جو پہلے ہی آپ کے قلب و دماغ پر مستولی ہو رہے ہیں تھوڑی دیر کے لیئے الگ کر دیجئے اور یوں خالی الذہن ہو کر ٹھنڈے دل سے بنگاہِ تفکر و تدبر غور کیجئے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ وہ کہاں تک صحیح ہے۔ یہ تاکید اِس لیئے ضروری سمجھی گئی ہے کہ مسئلہ زیرِ نظر جس قدر اہم ہے اسی قدر نازک بھی ہے۔ لہٰذا اہمیت و نزاکت کی اِس کش مکش میں قلب و دماغ میں تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔ اور

اگر آپ اِن جذبات کی رَو میں بہہ گئے جو فضا میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تو آپ حقیقت تک نہیں پہونچ سکیں گے۔ تگہ بصیرت سے بھی کام لیجئے اور دُعا کیجئے کہ:۔ اَللّٰھُمَّ اھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیم

آپ کسی مسلمان سے پُوچھیے کہ دین کس چیز کا نام ہے، وہ بلا تامل کہہ دیگا کہ قرآن و حدیث کا مجموعہ یہ چیز ہمارے دلوں میں اسقدر راسخ ہو چکی ہے کہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ اِسکے متعلق بھی کسی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ گویا یہ ایک ایسی حقیقتِ ثابتہ ہے۔ جو کبھی محلِ نظر نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی تردد کی گنجائش ہی نہیں۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں! یہ چیز بھی اس قابل ہے کہ اسپر غور و فکر کیا جائے۔ اور سوچا جائے کہ جو کچھ عام طور پر مشہور ہو چکا ہے وہ درحقیقت ایسا ہے یا نہیں۔ تو اس آواز کے خلاف کس قدر ہنگامہ برپا ہو جائیگا۔ اور مخالفت کی کتنی قوتیں ہوں گی جو اسکے مقابل ہجوم کر کے آجائیں گی۔ اب اگر آپ اِس ہنگامہ و ہجوم کے شور و غوغا میں کھو گئے۔ تو پھر بھی آپ حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے۔ اِسلئے آپ کو نہ صرف اپنے داخلی جذبات کے غیر محسوس طوفان کا ہی مقابلہ کرنا ہوگا۔ بلکہ اِن خارجی ہنگاموں کے غلغلہ انداز سیلاب کو بھی برداشت کرنا پڑیگا۔ اور حق بھی یہ ہے کہ جب تک اسقدر شدید جد و جہد نہ کی جائے عروسِ حقیقت بے نقاب جلوہ پیرا نہیں ہوتی۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہِ العَلِی العَظِیم۔

دین کے متعلق ایک چیز سے تو یقیناً آپ سب متفق ہوں گے یعنی یہ کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو ظنی اور قیاسی نہ ہو چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَکثَرُھُم اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغنِی مِنَ الحَقِّ شَیئًا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیمٌ بِمَا یَفعَلُونَ ۳۶	اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوائے کسی اور چیز کی اتباع نہیں کرتے یقیناً ظن۔ حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن اور حدیث) کے مجموعے کا نام دین سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی ظنی تو نہیں ہے؟ اور کیا یہ دونوں اجزاء اللہ اور اسکے رسول نے دین کی حیثیت سے مسلمانوں کو دئے ہیں! ہمارا خیال ہے کہ ان سوالات کے جواب سے مسئلہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔

پہلے تو قرآنِ کریم کو لیجیے۔ قرآن میں ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔ کہ یہ کتاب حق ہے:۔

وَالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ھُوَ الۡحَقُّ ۳۵/۳۱ جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کیا ہے وہ بالکل حق ہے حق الیقین ہے (وَاِنَّہٗ لَحَقُّ الۡیَقِیۡنِ۔ ۶۹/۵۱)

اس کتابِ عظیم کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ: ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ سراسر حق ہے یقینی ہے ظنی اور قیاسی نہیں۔ ریب و شکوک کی حدود سے بالاتر ہے۔

یہ تو ہے نفسِ کتاب کے متعلق۔ اب یہ کہ یقینی شے مسلمانوں کو ملی کیسے اور انکے پاس رہیگی کس حیثیت سے سو ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم حضورؐ پر نازل ہوا۔ اور اسکے متعلق۔ جمع و تدوین کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی۔

اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ۷۵/۱۷ یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اسکا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اور صرف جمع و تدوین ہی نہیں بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا ردّوبدل اور کسی نوعیت کی تحریف و الحاق نہ ہو سکے۔ فرمایا:۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۱۵/۹ یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں۔

اس حفاظت کو عملی شکل دینے کے لیے جناب نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا کہ:۔

یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ ۵/۶۷ اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دو۔

حضورؐ نے اس حکمِ خداوندی کی تعمیل میں جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے یعنی صحابہ کبارؓ کی ایک جماعت تھی جنہیں قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ لکھایا جاتا تھا۔ ہزاروں حفاظ تھے جنہیں لفظاً لفظاً یاد کرایا جاتا تھا پھر حضورؐ انکا یاد کردہ خود سنتے تھے۔ اُن کی تصحیح و تصویب فرماتے تھے، چنانچہ دُنیا سے تشریف لے جانے سے پیشتر حضورؐ نے کامل اطمینان کر لیا۔ کہ پیغامِ خداوندی جو آپؐ پر نازل ہوا تھا۔ وہ اپنی کامل و مکمل شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ لکھا ہوا محفوظ ہے۔ اور ہزاروں حفاظ کے سینے میں محفوظ ہے،

حجۃ الوداع کے عظیم الشان خطبہ میں حضورؐ نے لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے اس امر کا اقرار لیا۔ کہ آپؐ نے اس پیغام الٰہی کو ان تک پہونچا دیا ہے۔ اور اسکے بعد اللہ تعالیٰ کو اس پر گواہ قرار دیا۔ کہ اے مولا! تو شاہد ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ رسالت یوں ادا کر دیا ہے، اس انتظام و اطمینان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سند نازل ہوئی کہ۔ ﴿الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی﴾ آج کے دن ہم نے دین تمہارے لیے مکمل کر دیا۔ اور تمہارے اوپر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا۔ نبی اکرمؐ کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے حفاظت قرآن کریم کو سب سے بڑا فریضہ سمجھا۔ اور اسکے لیے عملی ذرائع اختیار کئے۔ حضورؐ نے قرآن کریم کو متفرق و منتشر نوشتوں پر لکھا ہوا چھوڑا تھا۔ حضرت ابا بکر صدیق رضؓ کے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ کے مشورہ سے حضرت زیدؓ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی جسنے ان متفرق نوشتوں کی شیرازہ بندی کر کے قرآن کریم کو ایک جامع کتاب کی شکل میں مدون کیا۔ پھر حضرت عثمان رضؓ نے قرآن کریم کو اختلاف قرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اس مصحف اوّل کی بہت سی نقول مختلف مراکز اسلامیہ میں بھجوائیں جن میں سے کئی ایک نسخے بجنسہٖ آج تک محفوظ چلے آتے ہیں۔ اسکے بعد یہ صحیفۂ ربانی آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحاتِ قرطاس پر اس انداز سے محفوظ چلا آ رہا ہے۔ کہ اپنے تو اپنے غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآن کریم موجود ہے۔ وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے انہیں دیا تھا۔ اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ اس لیے اسکا یہ آخری پیغام قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ یہ ہے یقینی چیز جس کے دین ہونے میں ظن و قیاس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

اب اس حصہ کو لیجئے جسے عام طور پر دین کا دوسرا جزو قرار دیا جاتا ہے یعنی مجموعۂ احادیث۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بھی اسی طرح یقینی ہے جس طرح قرآن کریم ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اسلیئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا۔ نہ انکے جمع کرنے کا حکم دیا۔ نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسولؐ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل رہا۔ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے اس لیے کہ

احادیث نبی اکرمؐ کے اقوال و اعمال و احوال کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر یہ جزو دین تھیں، تو جس طرح آپؐ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا۔ زبانی یاد کرایا۔ لوگوں سے سنا۔ دھرایا۔ اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا۔ کہ اسکا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے۔ احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیے تھا۔ اسلیے کہ منصب رسالت کا یہ تقاضا تھا۔ اور بہ حیثیت رسول حضورؐ کا یہ فریضہ تھا کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں اُمت کے پاس چھوڑتے لیکن حضورؐ نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اِسقدر حزم و احتیاط سے کام لیا۔ احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا۔ برعکس اِسکے اکثر کتب واحادیث میں ہی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ:-

لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (صحیح مسلم)

(مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو جسنے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز لکھی ہو اُسے مٹا ڈالے)۔

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اسلیے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی درخواست پر انھیں اجازت عطا فرما دی تھی کہ وہ چاہیں تو احادیث لکھ دیا کریں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی۔ اسکا حکم نہیں دیا تھا۔ اُسکے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا پھر اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اسنے کون کون سی حدیثیں لکھی ہیں۔ اور کس سے احادیث سُنی ہوں۔ اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے، کہ اس زمانہ میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اسلیے اُنکی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا۔ تو قرآن کریم لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اسکے لیے لوگوں کی یادداشت کیوں کافی نہ سمجھی گئی! اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم

لہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب تم احادیث کو یقینی نہیں سمجھتے۔ تو ان کو بطور دلیل کے پیش کیوں کرتے ہو۔ سو واضح رہے کہ یہ چیز بطور دلیل ان کے لیے پیش کیجاتی ہے جو انہیں یقینی مانتے ہیں تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خود احادیث بھی ان کے مسلک کے خلاف جاتی ہیں۔ ورنہ جہاں تک ہمارے لیے حجت شرعیہ اور اطمینان قلب کا تعلق ہے الحمدللہ کہ اللہ کی کتاب کافی ہے حسبنا کتاب اللہ اور اسکے بعد تاریخ میں وہ چیزیں جو کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔

کا تو لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا۔ اور پھر اُن سے سُن لیا جاتا تھا۔ اور اسکی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگرچہ احادیث کسی نے اپنے طور پر یاد بھی کرلی ہوں۔ تو اُمّت کے لیے وہ سند نہیں بن سکتیں، تا وقتیکہ نبی اکرمؐ اِن احادیث کو سُنکر اُنکے مُستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے۔ اور پھر وہی احادیث۔ قرآنِ کریم کی طرح۔ انہی الفاظ میں آگے نہ چلتیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمایئے۔ کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو اُنکے تحفظ کا کوئی سامان نہ کیا جاتا!

روایات سے ہمیں اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ کریم کے عِلاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قلمبند ہوئی تھیں۔ مثلاً وہ تحریری معاہدات۔ احکام۔ اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے۔ لیکن اِس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآنِ کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسبِ ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

(۱) پندرہ سو صحابہؓ کے نام وایک رجسٹر میں)

(۲) مکتوباتِ گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و اُمراء کے نام لکھے۔

(۳) تحریری احکام۔ فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

(۴) کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت علی رضؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔

اِن احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے اُنکی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی بعد میں یہ اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود ہی رہیں۔ لہٰذا کوئی حدیث بھی ایسی نہیں ہے۔ جو حضورؐ کے عہدِ مبارک میں لکھی گئی ہو۔ اور وہ اِس شکل میں ہمارے پاس موجود ہو۔ خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے۔ کہ حضرت ابن عباس رضؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (اُمّت کے لیے) کیا چھوڑا ہے تو آپ نے کہا کہ مَا تَرَكَ اِلَّا مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْن ۔ یعنے قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا بخاری جلد دوم کتاب فضائل القرآن۔

حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین رضؓ کا زمانہ آتا ہے، اِن برگزیدہ حضرات سے قرآنِ کریم

کی نشرو اشاعت اور حفاظت وصیانت میں جو کوششیں کیں انکا اجمالی ذکر اوپر آچکا ہے۔ اب دیکھیے کہ احادیث کی جمع و تدوین و ترویج وتحفظ میں انکا طرزِ عمل کیا رہا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے متعلق تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:۔

حضورؐ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے حدیثیں بیان کرتے ہو۔ اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا۔ اسلیئے تم لوگ رسول اللہؐ سے کوئی حدیث بیان نہ کرو۔ جو شخص تم سے حدیث پوچھے اُس سے کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے اُسکے حلال کیئے ہوئے کو حلال سمجھو۔ اور اُسکے حرام کیئے ہوئے کو حرام۔

یہیں تک نہیں بلکہ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ بھی تھا لیکن آپ نے اُسے یہ کہہ کر جلا دیا کہ مجھے خوف ہے کہ میں مرجاؤں اور یہ محفوظ رہ جائے۔ ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے انپر وثوق ہے لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں[1]۔

حضرت عمر رضؓ نے تو اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعب راوی ہیں کہ جب حضرت عمر رضؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ان سے تاکید کر دی کہ یاد رکھو تم ایسے مقام پر جاتے ہو، جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں اُلجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا تم اسی طریقہ سے حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے انھوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے مارتے۔

---

[1] مولانا شبلی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب الفاروق حصہ دوم کے صفحہ نمبر ۶۰ پر اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسپر کوئی تنقید نہیں فرمائی ہے ۱۲

یہ بھی روایت میں ہے۔ کہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ۔ ابودردا رضؓ اور ابومسعود انصاری کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ (ان تمام روایات کے لیے دیکھو تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے کہ ان روایات کی حجت کو محلِ نظر قرار دیدیا جائے۔ حالانکہ ہمارے نزدیک اُنکے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ میں اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے اسلئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے، کہ جس سے کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعۂ احادیث نہیں ملتا۔ جو اِن حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا اُن کی زیرِ نگرانی مُدون کیا گیا ہو۔ بلکہ حضرت عمر رضؓ کے سامنے تو ایک مرتبہ یہ معاملہ پیش بھی کیا گیا کہ احادیث کو لکھ لیا جائے حضرت عمر رضؓ نے کامل ایک ماہ تک اس معاملہ میں استخارہ کیا۔ لیکن اس کے بعد فرمایا کہ میں نے تحریرِ حدیث کا ذکر کیا تھا لیکن جب میں نے غور کیا تو اس قوم کا خیال آیا جنے خود ایک کتاب لکھی۔ اور اسپر اس قدر متوجہ ہوئی کہ خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کروں گا"۔ (طبقات ابن سعد)

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انھوں نے قرآن کریم کو مرتب کر کے مختلف ممالک میں اسکے نسخے بھجوائے گئے تھے۔ خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ مرتب کر کے شائع کیوں نہ کر دیتے؟ خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوین حدیث کے متعلق کوئی ایسا اقدام نہیں کیا گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس بات کا کسی کو خیال نہیں پیدا ہوا۔ سنہ اھ

لہ علامہ خضری کی کتاب فقہ اسلامی میں یہ روایت تنویر الحوالک کے حوالہ سے نقل ہے اس کتاب کا اردو ترجمہ دارالمصنفین نے شائع کیا ہے۔

کے قریب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضہ (اموی خلیفہ) نے کچھ احادیث کو جمع کرایا۔ [1] کے بعد امام شہاب الدین زھری رح (المتوفی سنہ ۱۲۴ھ) نے خلفائے بنی اُمیہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جسکے متعلق اُنکا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا۔ لیکن نہ تو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز رضہ کی جمع کردہ احادیث کسی مُدوّن صحیفہ کی شکل میں موجود رہیں اور نہ امام زھری رح کا مذکورۂ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے، بعد کی کتبِ احادیث میں اُن کی روایات ملتی ہیں۔ اِسکے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب لوگوں کو قرنِ اُولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ خیال پیدا بھی ہونا چاہیے تھا مسلمانوں کے لیے دُنیا میں عزیز ترین یادگار عہدِ مبارک کی ہے جس میں نیّرِ اسلام کا طلوع ہوا اور اس کی ضیا پاشیوں سے تمام دُنیا بقعۂ نور بنگئی۔ اِس دَور میں کتب و سیرت کی تصنیف کی ابتدا ہوئی ان تصانیف کا مسالہ (Material) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ یہ باتیں اِس تمام عہد کو محیط تھیں بعض حضرات نے اِس وسیع موضوع کو سمیٹا اور صرف انہی باتوں کو اکٹھا کیا۔ جو نبی اکرم ص کی طرف منسوب کی جاتی تھیں ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتب احادیث ہے۔ (احادیث کے معنی ہی باتیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اسوقت دستیاب ہو سکتا ہے، امام مالک رضہ (المتوفی سنہ ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے، اس میں مختلف نسخوں میں تین سو سے پانسو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالک رضہ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا اور دوسرے ائمہ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اِسی دَور میں کئی ایک کتب احادیث مُدوّن ہوئیں عہدِ عباسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اور اسکے ساتھ ہی کتب احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کرلی۔ کتب احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) ہیں۔ امام بخاری رح (المتوفی سنہ ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں، اور ان میں سے کانٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا۔ اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد

---

[1] مختصر جامع بیان العلم +

[illegible] احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے کتب احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔

تدوین کتب احادیث کی اس مختصر سی تاریخ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی۔ کہ احادیث کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ اگر یہ چیزیں بھی دین کا جزو ہوتیں تو ظاہر ہے کہ خود نبی اکرم ؐ احادیث کا مستند مجموعہ لکھوا کر چھوڑ جاتے، آپ ؐ کے بعد آپ کے جانشین (خلفائے راشدہ ؓ) اس مجموعہ کے مصدقہ نسخے مختلف مقامات میں بھیجتے۔ یہی مجموعہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ دین کا جزو بنا رہتا لیکن ایسا تو کسی نے نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح انفرادی طور پر بعض لوگوں نے کتب تاریخ تصنیف کیں۔ اسی طرح کتب احادیث کو مدون کیا۔ اب خیال فرمایئے کہ دین بھی ایسی چیز ہے۔ جسے خود اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم ؐ یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ امام بخاری یا ایسے دیگر حضرات نے ان باتوں کو یکجا جمع کر دیا۔ جو اس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں، ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتابیں موجود نہ تھیں۔ اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو دین کا آدھا حصہ تو (معاذ اللہ) بالکل کھویا ہوا تھا۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کی سند قرآن کریم میں بالتصریح فرما دے اور وہ رسول ؐ گرامی کہ جس کے بعد قیامت تک کوئی اور رسول ؐ نہ آنا ہو۔ وہ دین کے ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے۔

پھر ایک دوسری صورت بھی تھی جس طرح قرآن کریم محفوظ کیا گیا تھا اگر لوگ نبی اکرم ؐ کی احادیث کے الفاظ کو یاد کر لیتے اور وہی الفاظ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے، تا آنکہ وہ کتابی شکل میں لکھ لیے جاتے تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ کتب احادیث کا مجموعہ ایک یقینی چیز ہے لیکن یہ بات بھی نہیں ہوئی۔ احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں (بخاری اور مسلم سمیت) ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جسکے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اسکے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ ؐ نے فرمائے تھے۔ اس بات پر پھر غور کیجیے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جسکے الفاظ رسول اللہ ؐ کے الفاظ ہوں۔ تمام احادیث روایت بالمعنےٰ ہیں یعنی انکا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابی ؓ نے رسول اللہ ؐ سے کچھ سنا۔ اُسنے کچھ سمجھا،

اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا۔ اُس نے جو کچھ اخذ کیا۔ اُسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لائیے۔ اِس صورتِ حالات کو یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں۔ مہینہ دو مہینہ۔ سال دو سال نہیں بلکہ دو اڑھائی سو سال تک یونہی جاری رہے اور اسکے بعد لوگوں میں اس قسم کی پھیلی ہوئی باتوں کو یکجا جمع کیا جائے تو ان باتوں کو پہلے کہنے والے (یعنی نبی اکرم ﷺ) کے بیان فرمودہ مفہوم سے جسقدر تعلق ہوگا وہ ظاہر ہے، یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے، آپ ایک کمرہ میں دس آدمیوں کو بٹھا کر ایک کے کان میں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کیجئے اسکے بعد یہ بات کانوں کان منتقل ہوتی ہوئی جب پھر آپ تک پہونچے، تو آپ دیکھیں گے۔ کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا۔ اِس میں اور جو کچھ آپ دسویں آدمی سے سُن رہے ہیں اِس میں کس قدر فرق ہوتا ہے اور جب یہ سلسلہ اڑھائی سو سال تک جاری رہے۔ اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے سے یہ باتیں آگے منتقل ہوئی ہوں۔ تو ان میں جو اصلیت باقی رہیگی۔ وہ ظاہر ہے، جو بات کانوں کے راستہ قلب تک پہونچے، اور پھر قلب سے زبان کی راہ باہر آئے۔ اسپر قلب انسانی کی رنگینی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ آمیزش ارادۃً ہی ہو غیر ارادی طور پر غیر محسوس انداز سے اسکا اثر اس میں ضرور آجائے گا۔ ارباب جرح و تعدیل نے یہ ضرور کیا کہ ایک حدیث میں جسقدر راویوں کا سلسلہ آتا ہے اُنکے متعلق بڑی کد و کاوش سے یہ تحقیق کی کہ وہ ثقہ تھے، پرہیزگار تھے۔ متقی تھے لیکن یہ امر بالکل بدیہیات سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا۔ اِس بات کے لیے مستلزم نہیں کہ اسکی یادداشت بھی اچھی ہو، اور اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں حقائق و معارف کے سمجھنے کی استعداد اور پھر انہیں اصلی اسپرٹ (Spirit)

اور موقع و محل کی فقیہانہ جزئیات کو ملحوظ رکھ کر آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جائے یہ ایک ایسی کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے اور دیکھئے کہ کتنے آدمی آپ کو ایسے ملیں گے کہ اُنہوں نے عمر بھر جھوٹ نہ بولا ہو۔ صوم و صلوٰۃ کے شدت سے پابند ہوں۔ متقی اور پرہیزگار بھی ہوں۔ بایں ہمہ۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بات سمجھنے اور پھر اُسے بجنسہٖ آگے منتقل کرنے کی استعداد نہ ہو۔ خود یہ حقیقت کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم اسکے اپنے الفاظ میں محفوظ

رکھنے کا اسقدر محکم انتظام فرمایا۔ اس امر کی دلیل ہے کہ دین کے معاملہ میں صرف مفہوم کا آگے منتقل ہوتے جانا قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ اس قسم کی چیز کبھی یقینی نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ایک آیت قرآنی کو پڑھتے ہوں تو بڑے حزم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "قال اللہ تعالیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا) لیکن جب جب کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو اسکے بعد یہ الفاظ بھی دہرائے جاتے ہیں کہ "او کما قال رسول اللہ" (یعنی یوں یا جیسے رسول اللہؐ نے فرمایا ہو) یہ چیز بعد کی وضع کردہ نہیں۔ بلکہ خود صحابہؓ کا بھی یہی انداز تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تذکرہ میں مذکور ہے کہ "وہ جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو کانپ اُٹھتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ "اسطرح۔ یا اسکے مثل، یا اُسکے قریب" (یا للمسند دارمی) حضرت عمرؓ اسی خوف سے حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے۔ کہ کہیں مجھ سے حدیث کی روایت کرنے میں کمی بیشی نہ ہو جائے (انساب الاشراف البلاذری) یہ چیزیں اسپر شاہد ہیں کہ آج حدیث کو دین ماننے والوں کو بھی یقین نہیں ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے یہی فرمایا تھا۔ یا کچھ اور۔ اس لیئے احادیث کو اقوال رسول اللہؐ (حضورؐ کی باتیں) نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اقوال منسوب الی الرسول کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو جمع حدیث کے وقت رسول اللہؐ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں کہئے کہ ایسی چیز کبھی یقینی کہلا سکتی ہے۔ اور جب یہ اسقدر ظنی ہے۔ تو پھر دین کیسے بن سکتی ہے۔

یہاں تک تو ہم نے اس مفروضہ کے ماتحت لکھا ہے کہ جو کچھ راویوں نے بیان کیا۔ اس میں اُنہوں نے دانستہ کسی قسم کی تحریف نہیں کی جس چیز کو ایماندارانہ طور پر سمجھا کہ رسول اللہؐ کی طرف سے آئی ہے اُسے اپنی سمجھ کے مطابق دیانتداری سے آگے منتقل کر دیا۔ لیکن اسکے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیئے کہ اس اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ہزاروں ایسے منافق پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے لباس میں اپنی ظاہرداری کے تقوے اور ثقاہت کا سکہ جما کر لاکھوں حدیثیں وضع کیں۔ اور انھیں ذاتِ رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کر کے آگے منتقل کر دیا۔ ان میں بعض کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنی ان خبیثانہ حرکات کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن کتنے ایسے ہونگے جنکا راز افشا نہ ہو سکا پھر یہ ہی نہیں ہزاروں ایسے مسلمان تھے جو نہایت نیک نیتی سے ایسی حدیثیں وضع کرتے تھے۔

کہ لوگوں میں دین کا شوق پیدا ہو۔ مثلاً کسی بات کو انہوں نے اچھا سمجھا اور بجائے اِسکے کہ اُسے اپنی طرف سے کہیں۔ اُسے جنابِ رسولِ اکرم صلعم کی طرف منسوب کرکے پیش کر دیا کہ اسکی قیمت بڑھ جائے۔ اور اثر زیادہ ہو۔ اِس قسم کی وضع شدہ احادیث کا ٹھکانہ ہی نہیں تفصیل کے لیئے موضوعات مُلّا علی قاری وغیرہ دیکھئے۔ ارباب جرح وتعدیل نے معیارِ ثقاہت تقویٰ اور پرہیزگاری قرار دیا تھا۔ اِس قسم کے واضعینِ حدیث کی تقویٰ و پرہیزگاری میں کسے شبہ تھا لہٰذا اُن کی ثقاہت مسلّم تھی۔ یہ چیزیں بھی اِس طرح آپکا دین بن گئیں۔ آپ غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو جو قرآن نے ظنّی اور قیاسی قرار دے کر ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے تو اسکی یہی وجوہات ہیں۔ اوّل تو وہ ان الفاظ میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں۔ جن میں وہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اصل صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد ان کے جامعین نے اِن صحائف کو اِدھر اُدھر کی روایات کی بنا پر اکٹھا کیا تھا۔ پھر اُن میں وہ روایات بھی شامل ہو گئی تھیں جو لوگوں نے اِس دوران میں، وضع کی تھیں نیز وہ کچھ بھی جو خود انکے ارباب مذاہب احبار و رہبان نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ان میں شامل کر دیا تھا۔ اب اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ جو اِس طرح مدوّن ہوا تھا۔ قرآن کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں قرار پا سکتا تو فرمایئے کہ احادیث کے مجموعے۔ جو بالکل اسی طرح سے مُرتب ہوئے ہیں کس طرح یقینی قرار دیئے جا سکتے ہیں، اِس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے متعلق اربابِ جرح وتعدیل نے بڑی جانچ پڑتال کی لیکن یہ تمام کوششیں انسانی تھیں، ان حضرات کی کوششیں لائق صد آفرین سہی لیکن اُنکے متعلق یہ سمجھ لینا کہ اُنھوں نے اپنے سے پیشتر سینکڑوں برسوں کے انسانوں کے متعلق تحقیق و تفتیش کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان حضرات کو خدائی صفات کا حامل سمجھ لینا ہے۔ کتبِ احادیث کے متعلق زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تاریخ کی دوسری کتابوں سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں لیکن بالآخر یہ ہیں تو انسانی کارنامے۔ خدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو اُنکے ساتھ نہیں۔ اب جامعین حدیث کو اور علمارِ جرح وتعدیل کو تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا اور انکی ہر بات کو حرف کا توں تسلیم کر لینا ان کو بشریت کی سطح سے اوپر لے جانا ہے، اور حضرات رواۃ کے متعلق۔ خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور عدول کیوں نہ قرار دیئے گئے ہوں یہ عقیدہ رکھنا کہ

اُن سے غلط بیانی یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا امکان ہی نہ تھا۔ اُنکو معصوم اور منزہ عن الخطا قرار دینا ہے جو صرف حضرات انبیاء کرام کا ہی حصہ ہے، امام بخاری رحمۃ نے چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں، یعنی جو لوگ اُنکے سامنے موجود تھے اُن سے سُنیں۔ اور اُسکے بعد اپنی بصیرت کے مطابق ان میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر مُسترد قرار دیا۔ اور بقایا تین ہزار کے قریب اپنی کتاب میں درج کر لیں۔ لیکن غور فرمائیے کہ امام بخاری رحمۃ کے پاس کون سی سند تھی کہ انھوں نے جن تین ہزار احادیث کو اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا ہے، ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، وہ کتنے ہی بڑے عالم سہی تھے تو بالآخر انسان۔ اور ایک انسان کے متعلق سمجھ لینا کہ اُسکی تحقیق کا نتیجہ ایسا ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور وہ تنقید کی حد سے بالاتر ہے، سوائے شخصیت پرستی کے اور کیا ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے، کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ وہ ثقہ تھا یا نہیں تو یہ فیصلہ کتنا ہی بے لاگ کیوں نہ ہو۔ اس میں عام طور پر رجحاناتِ قلبی کا شائبہ آجائے گا۔ اور قلبی رجحانات میں عقیدہ کو بڑا دخل ہوتا ہے امام بخاری کو امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ۔ اِس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے۔ یا نہیں، اختلاف تھا۔ اِس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ وہ امام اعظمؒ کو ثقہ نہیں قرار دیتے پھر یہیں تک بس نہیں، چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے، اِسلئے تمام کوفہ والے غیر معتبر۔ ناقابلِ روایت حدیث قرار پا گئے، اور کوفہ چونکہ عراق میں ہے، اِسلئے عراق والے بھی اسی زُمرہ میں شمار ہو گئے۔ اور فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سَو حدیثوں میں سے ننانوے 99 چھوڑ دو۔ جو ایک رہی تو اُسے مشتبہ ہی سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر۔ دو جلیل القدر امام۔ یعنی امام ابوذرعہ رحہ۔ اور امام ابو حاتم رحہ نے خود امام بخاری رحہ کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے، اور اُن سے روایت ترک کر دی ہے، بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے، ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے، کہ امام مسلمؒ۔ امام بخاری رحہ کو مختل الحدیث (جھوٹ موٹ حدیث بنانے والا) قرار دیتے ہیں۔ اِن ائمہ علوم کی اس قسم کی باہمی چشمک کی بے شمار مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں بعض ائمہ کے اختلاف سے احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ ہمارے سنی اور شیعہ جماعتوں کا وجود ہے

سُنّی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں، اور انکا سلسلہ روایت تابعین رضؔ و صحابہ رضؔ تک پہونچتا ہے، جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبی اکرم ؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس سے بہت ہی مختلف تعلیم۔ احادیث کے ان مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں، اور انکا سلسلہ روایت بھی اسی طرح تابعین رضؔ و صحابہ رضؔ تک پہونچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سُنّی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لا سکتے، کہ وہ بزرگان دین جو ان احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں، وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ انکو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا۔ اب صورتِ معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث اُمت کو ملیں جو سُنّی حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں۔ اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض۔ اب کہیئے کہ کون سی تعلیم رسول اللہ کی قرار دی جائے اور اسے جزوِ دین سمجھا جائے۔ اور کون سی غلط! اور اگر کسی راوی کی ثقہ ہونے کے لیئے یہی شرط ہے کہ وہ اربابِ جرح و تعدیل یا جامعین احادیث کا ہم مسلک بھی ہو تو یہ تو صاف پارٹی بازی ہے، انصاف نہیں ہے، یہ کیا ضرور ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہوں۔ پھر ایک چیز اور بھی دلچسپ ہے، خود امام بخاری رح (اور دوسرے جامعین احادیث) جن بزرگوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی روایات مردود ٹھہراتے ہیں خود انہی کی روایات سے اپنے مجموعوں میں احادیث درج کر دیتے ہیں۔ دیکھیے میزان الاعتدال از علامہ ذہبی و تدریب الراوی وغیرہ۔

ایک چیز اور بھی قابل غور ہے، یہ سب کو تسلیم ہے کہ حضورؐ کے بعض کام بہ منصب رسالت ہوتے تھے، اور بعض بالکل ذاتی حیثیت سے، اس باب میں خود نبی اکرم ؐ کے ارشادات موجود ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ احادیث کے مجموعوں میں جس قدر اقوال و اعمال نبی اکرم ؐ کی طرف منسوب کیئے جاتے ہیں، ان میں یہ تخصیص کہیں نہیں کی گئی کہ حضورؐ نے کس حیثیت سے ایسا کہا۔ اب ہم کیسے معلوم کریں کہ حضورؐ کا فلاں ارشاد منصبِ رسالت کی حیثیت سے تھا اور فلاں ذاتی حیثیت سے، لہٰذا ظاہر ہے

کہ جن باتوں کا پہلے اقوال رسول اللہ صلعم ہونا ہی ظنی ہو، اور پھر یہ بھی یقینی نہ ہو، کہ حضورؐ نے اُسے کس حیثیت سے فرمایا تھا، اُسے دین قرار دیدینا کس قدر زیادتی ہے، یہ مجموعے تو رسول اللہ صلعم نے اُمت کو نہیں دیئے۔ کیسے کہا جائے کہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کو دین قرار دیئے گئے ہیں!

یہ تو ہیں خارجی شہادات، جن سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ احادیث نہ خود نبی اکرم صلعم کے نزدیک جزوِ دین تھیں نہ صحابہ کبارؓ نے انھیں ایسا سمجھا اور احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں جسکے متعلق دعویٰ کیا جاسکے کہ وہ رسولِ اکرم صلعم کے الفاظ ہیں لیکن ان سب سے بڑھکر داخلی شہادات خود ان مجموعوں کے مشمولات ر Contents ہیں، ان میں کس کس قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ اُنکے ذکر سے میری روح کانپتی ہے، ہاتھ میں قلم لرزتا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ بیان آپ کو بے حد تعجب انگیز اور حیرتناک معلوم ہوگا اور معلوم ہونا بھی چاہیئے اسلیئے کہ ہمارے دلوں میں ان مجموعوں کی عزت وعظمت قریب قریب قرآن کریم کے درجہ تک کی ہے۔ لہٰذا انکے متعلق ایسی بات یقیناً تحیر انگیز ہوگی لیکن میں آپ سے صرف اتنا عرض کروں گا، کہ آپ نہ میری سنیئے اور نہ کسی اور کی بلکہ صحیح بخاری لے کر خود مطالعہ کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ میں نے کیا لکھا ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ سے کہا جائیگا، کہ ذرا سوچئے تو سہی امام بخاری علیہ الرحمۃ اتنے پایہ کے امام پھر انکے بعد اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں کتنے بڑے جلیل القدر علماء عظام و بزرگانِ کرام ایسے گزرے ہیں، جنہوں نے اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہو کیئے ایسی کتاب میں (پناہ بخدا) کوئی اس قسم کی بات ہوسکتی ہے، اسکے جواب میں میں پھر یہی عرض کرونگا کہ ان بزرگانِ سلف (علیہم الرحمۃ) کی عزت و توقیر بجا اور درست لیکن جب ہمارے پاس بخاری شریف موجود ہے تو ہم اسے خود کیوں نہ ایک نظر دیکھ لیں، آجکل تو بخاری شریف کا اُردو ترجمہ بھی مل سکتا ہے، آپ عربی نہیں جانتے تو اُردو ترجمہ ہی دیکھ لیں، اور اسکے بعد علیٰ وجہ البصیرت فیصلہ فرمائیں کہ میں نے درست لکھا ہے یا نہیں آپ کو اس میں ایسی باتیں ملیں گی جنہیں آپ کبھی جناب نبی اکرم صلعم کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کرنے کی جرات نہیں کرینگے۔ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جو انسانیت کے معراج کبریٰ کا مظہرِ اتم تھی وہ ہستی گرامی مرتبت (فداہ ابی و امی)، جو علم و ایقان کے اُفق اعلیٰ پر جلوہ افروز

کائنات تھی۔ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ اس فخرِ موجودات رحمۃ اللعالمینؐ کی ذاتِ عظمت مآب کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔

پھر کہا یہ جاتا ہے کہ یہ مجموعے ظنی ہی سہی لیکن دنیا میں کتنی ظنی باتیں ہیں جنہیں ہم صحیح تسلیم کر لیتے ہیں، اور ہمارا روزمرّہ کا کاروبار ہی اس چیز پر چلتا ہے، دیکھئے آپ تاریخ کے واقعات کو مانتے ہیں، حالانکہ وہ بھی ظنی ہوتے ہیں، آپ روز اخبارات میں خبریں پڑھتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی یقینی نہیں ہوتیں، پھر احادیث سے کیا چڑ ہے، کہ آپ انھیں یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ظنی ہیں۔

دلیل بظاہر معقول نظر آتی ہے۔ لیکن ذرا سوچنے کے بعد ان دونوں باتوں میں فرق کتنا بڑا ہے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے، تاریخ یا اخبارات ہمارے لیے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں میرا جی چاہے ایک واقعہ کو صحیح تسلیم کروں اور اگر اسکے خلاف میرے پاس دلائل ہوں تو یہ کہہ کر رد کر دوں کہ مجھے اسکی صحت پر شبہ ہے بر عکس اسکے احادیث ہمارے لیے دین قرار دی جاتی ہیں۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں اگر مجھے ان کے متعلق ذرا سا بھی تردد پیدا ہو جائے تو ایمان کی خیر نہیں، آپ نے دیکھا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے مثلاً تاریخ میں لکھا ہو کہ فلاں بادشاہ نے فلاں مقام پر جھوٹ سے کام لیا۔ تو میں چاہوں تو اسے صحیح تسلیم کروں۔ نہ چاہوں تو اُسے مسترد کر دوں۔ نہ مجھ پر اس باب میں کوئی پابندی عائد ہوتی ہے، نہ میرے ایمان پر کوئی اثر پڑتا ہے، لیکن جب بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے آئے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا" تو چونکہ حدیث کو جزوِ دین قرار دیدیا گیا ہے۔ اسلئے اسکا تسلیم کرنا مجھ پر لازم ہو گیا۔ اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو حدیث کے متعلق شک کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہوں۔ اور اگر اس کی صحت پر ایمان لاتا ہوں تو خدا کے ایک برگزیدہ نبیؐ کو (معاذاللہ) جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، یا مثلاً اخبار میں آپ دیکھتے ہیں کہ فلاں شہر میں کسی شخص نے ایک دوسرے شخص کی ناک کاٹ ڈالی۔ تو اسے ماننا نہ ماننا آپ کے ایمان کا جزو نہیں۔ لیکن جب آپ بخاری شریف کی اس حدیث کو پڑھینگے کہ "جب ملک الموت حضرت موسےٰؑ کی روح قبض کرنے کے لیے آئے تو حضرت موسےٰ نے انکے ایک ایسا تھپیڑ مارا کہ وہ کانے ہو گئے

تو آپ کو اس واقعہ کو صحیح ماننا پڑیگا کہ اس میں شک کرنیسے آپ دین میں شک کر رہے ہیں۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ دنیا کی دوسری ظنی چیزوں کے تسلیم کرنے میں، اور ایک ایسی ظنی چیز کے تسلیم کرنے میں۔ جسے آپ کے دین کا جزو قرار دیا گیا ہو۔ کتنا بڑا فرق ہے۔ ہم خود بھی کہتے ہیں کہ چونکہ احادیث یقینی نہیں ظنی ہیں۔ اسلیئے یہ دین نہیں بن سکتیں۔ اُن کی حیثیت تاریخ کی ہے اور تاریخ تنقید کی حد سے بالاتر نہیں ہوتی۔ آج اگر کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یقینی طور پر ثابت کیا جا سکے، کہ وہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے تو پھر اُسے جو دین نہ مانے، اُسے دین سے کیا علاقہ۔ کہ یہ وہ معصیت رسول ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے۔ لیکن جب کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یہ شکل نہ ہو تو فرمایئے، ایسے ظنی مجموعہ کو دین کیسے ٹھہرایا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن کریم کی رُو سے رسول اللہؐ کی اتباع فرض ہوا اور احادیثِ رسول اللہؐ ظنی ہونیکی وجہ سے دین نہیں بن سکتیں تو پھر حضورؐ کی اتباع کس طرح کی جائیگی۔ سو ایک بات تو واضح ہے۔ کہ اگر حضورؐ کی اتباع احادیث کے ذریعہ سے ہونی تھی تو حضورؐ اس قسم کے ارشادات کو لکھوا کر محفوظ شکل میں امت کو دے کر جاتے۔ اُمت اسکی اتباع کرتی۔ سو جب حضورؐ نے خود ایسا نہیں کیا۔ تو یہ ظاہر ہے کہ منشائے دین یہ نہیں تھا۔ کہ حضورؐ کی اتباع احادیثِ قولی کی ذریعہ سے کی جائے۔ اتباع کی کوئی دوسری شکل ہوگی یہ دوسری شکل وہ ہے جسے قرآنِ کریم نے اُسوہ کہا ہے،

یعنی قرآن کریم نے جن ایسی باتوں کا حکم دیا جو عملی شکل میں سامنے آئے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں حضورؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ اِن احکام کی تعمیل کیسے ہوگی۔ مثلاً قرآنِ کریم نے حکم دیا کہ اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) نماز کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اُسے نبی اکرمؐ نے خود نماز پڑھ کر پڑھا کر بتا دیا۔ رسول اللہؐ کے اس عمل کی اتباع صحابہ کبارؓ نے کی۔ اُنکے بعد۔ بعد میں آنے والوں نے اُنہیں دیکھ کر ویسا ہی کیا۔ اور یہ سلسلہ متواتر اِس وقت تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہیگا عمل متواتر چونکہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے اسلیئے اسکے آگے منتقل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی آپکا بیٹا آپکی تمام باتیں یاد نہیں رکھ سکتا لیکن جس طرح آپ اسکے سامنے نماز پڑھتے ہیں، دعا

مانگتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح کرنے لگتا ہے، اور یوں یہ عمل باپ سے بیٹے کی طرف، یعنی متقدمین سے متاخرین کی طرف منتقل ہوتا چلا آتا ہے، لہٰذا دین نام ہوا قرآن کریم اور عمل متواتر کا، اس میں شبہ نہیں کہ اس عمل متواتر کی بعض جزئیات کے بارے میں مسلمانوں کے فرقوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور بنگاہِ تعمق دیکھا جائے تو یہ اختلاف روایات ہی کے پیدا کردہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اختلافات بالکل فرعی حیثیت کے ہیں اصولی نوعیت کے نہیں، اسوقت مشکل یہ ہے کہ لوگ ان اختلافات کا فیصلہ پھر انہی روایات کی رُو سے کرنا چاہتے ہیں جو انکی تخلیق کا موجب ہیں اسلیے اس قسم کی تمام مناظرانہ کوششیں اور بحث و جدل کی محفلیں ان اختلافات کو دُور کرنے کے بجائے انہیں اور محکم کیے جا رہی ہیں۔ لہٰذا ان اختلافات کے رفع کرنے کا یہ طریق بنیادی طور پر غلط ہے۔ اسکا صرف ایک حل ہے کہ مسلمانوں میں جب کبھی پھر سے حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو جائے، تو مرکزِ ملت، مجلسِ شوریٰ کی مشاورت سے قرآن کریم کی بنیادوں پر تاریخ کی روشنی میں کسی فیصلہ پر پہنچیں تو وہ فیصلہ اُمت میں نافذ العمل ہو جائے۔ اسوقت یہ چیز کچھ مشکل سی نظر آتی ہے، لیکن جب حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے بعد قرآنی ماحول پیدا ہو جائے گا تو صحیح بصیرت رکھنے والی نگاہوں میں خود بخود وہ روشنی آجائے گی جو اُسوۂ حسنہ کے امتیازی خد و خال کو نمایاں کر دے گی۔ جب تک ہم شخصیت پرستی کے ان اغلال و سلاسل کو توڑ نہیں دیتے۔ اس آزادی کی فطری فضا میں سانس نہیں لے سکتے۔ جو مشیتِ ایزدی نے متعین فرمائی تھی۔ صدیوں کی شخصیت پرستی سے ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ نہ ہمارا دماغ اپنا ہے، نہ دل، نہ آنکھیں اپنی ہیں نہ ان کی روشنی۔ ہم سوچتے ہیں تو دوسروں کے دماغ سے، سمجھتے ہیں تو دوسروں کے قلوب سے۔ دیکھتے ہیں تو دوسروں کی آنکھوں سے، لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسوۂ حسنہ (عمل متواتر) میں جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے وہ فرعی اور جزئی ہی سہی لیکن اب یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان تمام مختلف صورتوں میں کون سی شکل نبی اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس قسم کے معمولی اختلاف کو (مثلاً نماز میں ہاتھ ناف پر باندھے جائیں یا سینہ پر) خود نبی اکرم ﷺ نے بھی اہمیت نہیں دی، یا تو آپ نے مختلف مقامات پر ان چھوٹے چھوٹے

اختلافات کے ساتھ نماز پڑھی ہے' یا ان میں تدریجاً تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ ہم نے جو طریقہ تجویز کیا ہے وہ صرف ملت میں وحدت قائم کرنیکی غرض سے ہے ورنہ اگر ان جزئی اختلافات کو دین قرار دیکر انھیں فرقہ بندی کی بنیاد ہی نہ بنا لیا جائے تو ان اختلافات سے کچھ حرج بھی واقع نہیں ہوتا۔ تاہم بہرحال جزو دین ہیں نبی اکرمؐ کی اس حیثیت کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ تھا کہ پنجاب میں "اہلِ قرآن" کا نیا فرقہ پیدا ہو گیا، اور جو قدم اصلاح کے لیے اٹھا تھا۔ الٹا خرابی کے گڑھے میں گر گیا۔ قرآن کے ساتھ جب تک اسوۂ حسنہ (عمل متواتر) شامل نہ ہو، دینؔ کی تکمیل نہیں ہو سکتی +

ماحصل یہ۔ تصریحات بالا سے یہ امور واضح ہو گئے ہونگے کہ:۔

(۱) دین یقینی ہونا چاہیے۔ ظنی شئے دین نہیں بن سکتی۔

(۲) یقینی چیز قرآنِ کریم ہے جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا اور نبی اکرمؐ نے اسکے الفاظ محفوظ کر کے اسے اُمت کے پاس چھوڑا۔ اور پورا پورا اطمینان کر لیا۔ کہ اُسکے الفاظ مختلف نوشتوں میں اور حفاظ کے سینے میں محفوظ ہو چکے ہیں، حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین رضؓ نے اسی قرآن کی حفاظت اور نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔

(۳) قرآنِ کریم کے علاوہ نبی اکرمؐ نے کسی چیز کو نہ لکھوایا نہ یاد کرایا۔ نہ سُنا، نہ اسکی صحت کی کوئی سند عطا فرمائی۔ اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین رضؓ نے بھی نہ احادیث کا کوئی مجموعہ تیار کرایا۔ نہ کوئی جماعت پیدا کی جو انھیں یاد کرے۔ برعکس اسکے ایسی شہادتیں پائی جاتی ہیں جنسے ظاہر ہے کہ حضورؐ اور اُنکے جانشینوں نے اسکی مخالفت کی +

(۴) جب لوگوں کو صدرِ اول کی تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو بعض حضرات کو اس امر کا بھی خیال ہوا کہ خاص وہ اقوال و احوال جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، انھیں الگ کتابوں میں جمع کر دیا جائے انہی کا نام کتبِ احادیث ہے۔

(۵) احادیث کی وہ کتابیں جنہیں مستند ترین سمجھا جاتا ہے (یعنی صحیحین) حضورؐ کے قریب دو ڈھائی سو

برس کے بعد مدون ہوئیں اصحاح ستہ میں سے اولین کتاب بھی ڈیڑھ سو برس بعد مدون ہوئی، ان کا ذریعہ تدوین وہ روایات تھیں جو اسوقت لوگوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

(۶) یہ روایات قرآن کریم کی طرح لوگوں میں لفظاً منتقل ہوکر نہیں آئی تھیں، بلکہ انکا مفہوم منتقل ہوکر آتا رہا۔

(۷) کتبِ احادیث میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جسکے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اُسکے الفاظ خود رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔

(۸) حضرات جامعین احادیث کے بعد ارباب جرح و تعدیل نے یہ فیصلے کئے کہ فلاں فلاں راوی معتبر ہے اور فلاں فلاں غیر معتبر یعنے انسانوں نے اپنے سینکڑوں برس پہلے کے انسانوں کی ثقاہت کے متعلق فیصلے کئے اور انہی فیصلوں کے مطابق احادیث صحیح و ضعیف قرار پائیں۔

(۹) اِن مجموعوں میں ایسی باتیں موجود ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں جنسے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور انبیاء کرام کی شان پر طعن پایا جاتا ہے جنسے بصیرت ابا اور عقلِ سلیم بغاوت کرتی ہے اور جن میں ایسی ایسی چیزیں ملتی ہیں جنہیں آپ نبی اکرم کی طرف منسوب کرنیکی کبھی جرأت نہ کر سکیں گے اسکے لئے آپ زیادہ نہیں تو صرف ایک صحیح بخاری کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ یہ درست ہے یا نہیں۔

(۱۰) یہ ہیں وہ مجموعے جنہیں قرآن کریم کے ساتھ دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ "احادیث قرآن کریم کی اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن احادیث کا محتاج ہے" (امام اوزاعی رح) اور یہ کہ "احادیث قرآن پر قاضی ہیں"۔ (امام یحییٰ) یعنی قرآن اور احادیث میں اگر تعارض ہو تو جو فیصلہ احادیث دیں وہ قابل قبول ہوگا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ حدیث کے صحیح ہونے کا یہ اُصول بھی قرار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو لیکن احادیث کو دیکھنے سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ اصول تبرکاً داخل رہا عملی طور پر اس سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ عملاً یہی اصول کارفرما رہا کہ احادیث کے راوی کیسے ہیں یعنی اگر ایک حدیث کا سلسلہ اسناد (راویوں کا سلسلہ) معتبر قرار دیدیا گیا ہو تو وہ حدیث صحیح قرار پا جائیگی۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ:-

(۱) یقینی چیز قرآن مجید ہے۔ اور دین اسی کے اندر ہے۔

(۲) قرآن کریم کے وہ احکام جنہیں عملی شکل میں دکھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں نبی اکرمؐ نے عمل کرکے امت کو دکھا دیا۔

اب یہ عمل محسوس امت میں تواتر سے چلا آتا ہے۔ اسلئے یہ اعمال رسول اللہ قرآن کریم کے مجمل احکام کی عملی تفسیر ہیں۔ لہذا دین قرآن کریم اور عمل متواتر ہے۔ اور بس۔ اس میں نہ کمی ہوسکتی ہے نہ بیشی۔

(۳) احادیث کی حیثیت تاریخ کی ہے، لہذا یہ مجموعے تنقید کی حد سے بالاتر نہیں جس طرح امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے قریب تین ہزار کا انتخاب فرما کر باقیوں کو مسترد کر دی تھیں۔ اسی طرح ان کے مجموعہ سے بھی ایسی احادیث الگ کی جاسکتی ہیں جو دین کی معیار پر صحیح نہیں اترتیں۔ اسلئے کہ یہ تسلیم کرلینا کہ راویوں نے کسی ایک بات کو صحیح نہیں سمجھا اس بات سے کہیں بہتر ہے۔ کہ ایک ایسی چیز کو ذات رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے جو انکے شایان شان نہ ہو۔ اس قسم کی تنقید و تنقیح کے بعد احادیث کے ان مجموعوں سے ہم دین کے سمجھنے میں اور جزئیات کی تشکیل میں استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔ دین یہ پھر بھی نہیں قرار نہیں دی جاسکتیں کہ یہ سب انسانی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اللہ اور اسکے رسولؐ کی سند انکے ساتھ نہیں مگر

(۵) اور یہ سب اسوقت ہوسکتا ہے، جب آپ ہر انسان کو اسکی اپنی جگہ پر رکھیں۔ خدائی رتبہ نہ دیدیں۔

مجھے اس امر کا خوب احساس ہے کہ ان حقائق کے اظہار پر کس قدر تموّج پیدا کیا جائیگا۔ اسلئے کہ جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے عقائد (خواہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں) انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اور وہ انکے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرسکتا۔ اسلئے ان خیالات کی مخالفت میں ہر ممکن حربہ استعمال کیا جائیگا سب سے پہلے تو قسم قسم کے لیبل تراشے جائینگے کہا جائیگا کہ یہ چکڑالوی ہے۔ اہل قرآن ہے منکر حدیث ہے اور نہ معلوم کیا کیا ہے۔ اسکے بعد عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر مشتعل کیا جائے گا۔ کہ "لو دیکھو! یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ کی احادیث (نعوذ باللہ) رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ ایسے ایسے جلیل المرتبت بزرگان کرام

جن مجموعوں کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ مانتے چلے آئے ہیں۔ یہ انہیں ظنی قرار دے رہا ہے لو اور سنو یہ سب سے انوکھا اسلام کو سمجھنے والا پیدا ہوا ہے" وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ کہا جائیگا لیکن میں آپ سے صرف اتنی گزارش کروں گا کہ آپ ان سطور کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیجئے۔ اور معترض سے صرف اتنا پوچھ کر وہ اپنے جذبات و معتقدات سے الگ ہو کر بتائیں کہ اس میں کہیں غلط بیانی سے کام تو نہیں لیا گیا! اور اگر آپ مطمئن ہوں کہ جو کچھ کہا گیا ہے، وہ صحیح ہے، تو پھر آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کیا اس قسم کی ظنی چیزیں دین قرار دیئے جانے کے قابل ہیں۔ اور کتب احادیث (مثلاً بخاری شریف) کو پڑھ کر غور فرمائیے کہ ان میں جس قسم کی روایات موجود ہیں وہ کسی صورت میں بھی حضور نبی اکرم ؐ کی ذات اقدس کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں۔ وفیھا آیات لقوم یعقلون۔ (باقی)

تنقید

عمرِ دی گریٹ

آج سے تیس برس پیشتر جب مولانا ظفر علی خان نے ڈریپر کی مشہور کتاب کا ترجمہ بعنوان "معرکۂ مذہب و سائنس" شائع کیا ہے تو ایک دنیا پکار اٹھی تھی کہ ہاں! ترجمہ اسے کہتے ہیں۔ لیکن اسوقت بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ مولانا صاحب جسطرح انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں یہ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اردو سے انگریزی میں بھی بلاتکلف ترجمہ کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ زیر نظر کتاب سے لگ سکتا ہے جو مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی شہرۂ آفاق کتاب "الفاروق" کے حصہ اول کا انگریزی ترجمہ ہے۔ الفاروق کا ترجمہ آسان کام نہ تھا لیکن مولانا صاحب نے اسے بڑی خوبی سے سرانجام دیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں مشرقی اندازِ بیان غالب آگیا ہے۔ جسکی وجہ ظاہر ہے کہ مولانا صاحب نے آزاد ترجمہ نہیں کیا۔ شیخ محمد اشرف صاحب کتب فروش۔ کشمیری بازار لاہور نے اس ترجمہ کو جو چالیس برس سے مولانا صاحب کے دفاترِ مسودات میں بند پڑا تھا، نہایت حسنِ ذوق سے شائع کیا ہے۔ طباعت۔ کتابت۔ کاغذ۔ جلد۔ گرد پوش۔ ولایت میں چھپی ہوئی کتابوں سے کسی صورت میں بھی کم نہیں۔ غالباً اس لئے قیمت بھی چار روپیہ رکھی گئی ہے۔

مولانا ظفر علی خان کی ان چیزوں کو دیکھ کر اس امر پر افسوس آتا ہے کہ قحط الرجال کی وجہ سے ہمارے ہاں ایک شخص اپنے آپ کو صرف اسی شعبہ تک محدود نہیں رکھ سکتا جس کے لئے فطرت نے اسے مخصوص کیا ہوتا ہے اگر مولانا صاحب کا دائرہ سعی و عمل صحافت و تصانیف تک ہی محدود رہنے پاتا تو نہ معلوم اسوقت تک قوم کے پاس کتنا گراں قدر سرمایہ جمع ہو جاتا اور انکی ذہنی تربیت بھی کیسی عمدہ ہو جاتی۔ اور اس باب میں ایک مولانا صاحب پر ہی کیا موقوف ہے۔ ہماری قوم کے اکثر دماغوں کیسا تھ یہی ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔

نظر بر خُطبۂ صدارت

راسٹرپتی مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد | کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا | پرستد مومن و کافر تراشد

جیسا کہ ہم نے اشاعتِ سابقہ میں عرض کیا تھا۔ مولانا آزاد صاحب کے انتخابِ صدارت سے ہمیں ایک خوشی ضرور ہوئی تھی اور وہ یہ کہ اب خدا خدا کرکے وہ صبر آزما سکوت ٹوٹے گا جس نے بیس سال سے یہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ

دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

چنانچہ لاہور کی تقریر کے بعد کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کی تقریب پر مولانا صاحب کو خطبۂ صدارت سنانا پڑا۔ جس میں ان سے وہ سب کچھ کہلوایا گیا جس کے کہنے سے وہ اتنا عرصہ پہلو تہی کرتے چلے آرہے تھے۔ ہم کانگریس کے اربابِ بست و کشاد کے رہینِ کرم ہیں کہ انھوں نے حضرت مولانا کا یہ اعزاز انتظار فرما کر "سادگی و پرکاری" کے ان حسین و جمیل نظر فریب پردوں کو اٹھا دیا جن میں مولانا صاحب مدت سے چھپے بیٹھے تھے اور جن کی مرصّع کاریوں کی بناء پر بہت سے ابلہ فریب حضر بیچارے سادہ لوح مسلمانوں کو دامِ تزویر میں پھنسا لیا کرتے تھے۔ اب حقیقت بے نقاب ہوگئی ا کسی کو یہ کہکر دجل و تلبیس کا موقع نہ رہا کہ "ہاں۔ حضرت مولانا نے بھی ہم سے تخلیہ کی گفتگو میں فرمایا ہے کہ میرا عقیدہ بھی وہی ہے جو جمہور مسلمانوں کا ہے۔" اب پردے اٹھ گئے۔ اب مولانا صاحب کے خیالات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیا یہ کانگریس کے اربابِ حل و عقد کا کچھ کم احسان ہے!

اس خطبہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے۔ آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا نام کہیں دکھائی نہیں دیگا۔ وہ مولانا آزاد کہ جن کی عہد اسلامی میں یہ حالت تھی کہ ہر دوسرے فقرے کے بعد آیاتِ قرآنی اور ہر تیسرے جملہ کے بعد کوئی حدیثِ مقدسہ آجاتی تھی۔ آج ان کی یہ حالت ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ یہ جھجکتے ہیں۔ اور تو اور خطبہ صدارت کی ابتداء میں بسم اللہ تک بھی نہیں لکھی گئی۔

انقلابات ہیں زمانے کے

کہہ دیا جائے گا کہ یہ خطبہ چونکہ مختلف مذاہب و ملل کے لوگوں کے اجتماع میں پیش کیا جانا تھا اس لئے اس میں قرآن و حدیث کی ضرورت نہ تھی نہ ہی اس امر کی حاجت کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے کیا جائے۔ کیونکہ اس مجمع میں بہت سے ایسے سامعین بھی تھے جو سرے سے خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں — بجا اور درست! یہی تو ہم کہتے ہیں کہ جب ایک مسلمان کو متحدہ قومیت کا چولہ پہننا پڑتا ہے تو اسے اپنے اسلامی مقام سے ہٹنا ضرور پڑتا ہے۔ اور مسلمان جب اپنے اصلی مقام سے ہٹا، تو پھر دنیاوی اصطلاح میں وہ کچھ بھی کیوں نہ بن جائے مسلمان تو باقی نہیں رہتا۔ مسلمان رہے تو اور کچھ نہیں تو آغازِ کلام تو اللہ کے نام سے کرے۔

ہم اشاعتِ طلوعِ اسلام کی اس دو سالہ مدت میں متعدد مقامات پر مولانا آزاد کے دورِ الہلال کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا موجودہ مسلک خود انہی کے سابقہ دور کے الفاظ میں کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔ اگر ان تمام اقتباسات کو یکجا جمع کر دیا جائے جو ہم اس ضمن میں متفرق طور پر پیش کرتے رہے ہیں تو وہ ایک ایسا مصفا آئینہ بن سکتا ہے جس میں حضرت مولانا کے صحیح خد و خال نمایاں طور پر نظر آ سکتے ہیں۔ ان اقتباسات کے جواب میں ہمارے اکثر دوستوں نے ہمیں لکھا کہ مولانا صاحب اب ان پارینہ داستانوں سے تائب ہو چکے ہیں۔ یہ انسانی خیالات تھے۔ جن میں ہر آن تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ مولانا صاحب اپنے اس وقت کے خیالات کی تائید میں ہمیشہ کتاب و سنت کی نصوصِ صریحہ

پیش کیا کرتے تھے۔ اور اب موجودہ خیالات کی تائید میں جو ان کے دورِ اول کے خیالات سے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں کبھی بھولے سے بھی قرآن و حدیث کی سند نہیں لاتے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ مولانا صاحب پر جن حقائق کا اب انکشاف ہوا ہے۔ ان کے پیشِ نظر وہ اپنے سابقہ اسلامی خیالات کو باطل سمجھتے ہیں۔ الحمد کہ مولانا نے ہماری مشکل بھی حل کر دی۔ اور اپنے اس خطبہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ میرا مسلک آج بھی وہی ہے جو الہلال کے زمانہ میں تھا۔ فرماتے ہیں

"مجھے معلوم نہیں آپ لوگوں میں کتنے ایسے آدمی ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔" (خطبہ صدارت ص۲۸)

دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں۔

"میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے۔ میں ان کے اندر کھڑا رہا۔ اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو جھٹلاؤں۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنی ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔" (ص۳۵)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہئے کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ حافظہ تازہ کرنے کی ضرورت مخاطبین کو ہے یا خود مولانا صاحب کو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کے پاس الہلال کا کوئی پرچہ بھی موجود نہیں ورنہ اس بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعویٰ کبھی نہ کرتے کہ جو کچھ میں ۱۹۱۲ء میں کہتا تھا آج بھی وہی کہتا ہوں۔ آیئے ہم مولانا صاحب کو بتائیں کہ وہ ۱۹۱۲ء میں کیا کہتے تھے اور آج کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا صاحب ذرا توجہ سے سنیں کہ بڑی گہری

تفکر طلب باتیں ہیں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس تمام خطبہ میں کہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام نہیں آیا۔ اسلام کے کسی بزرگ کی جلالت عظمت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بھولے سے بھی کسی اسلامی تاریخی واقعہ کا اشارہ تک نہیں آنے پایا۔ لیکن اس میں اگر کسی کی عظمت کا اعتراف ہے تو (نعوذ باللہ) اس وجودِ اقدس و اعظم کی عظمت کا جو منزّہ عن الخطاء قرار پا جانے کی وجہ سے نیشنلسٹ کے نزدیک خدائی صفات کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

" وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم رُوح کو کبھی جھکنے نہیں دیتا " (ص۲۱)

مہاتما گاندھی - عظیم رُوح - اللہ اکبر !!!

کبھی مولانا صاحب رُوح کی عظمت و رفعت کا یہ معیار قرار دیا کرتے تھے۔

" اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبتِ الٰہی اور انقطاع ما سوی اللہ میں ترقی کرتا ہے اتنا ہی اس کے اعمال میں استغراقِ الٰہی اور نورِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے۔ اور ان کی رُوح فیضانِ الٰہی سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ تکمیلِ مرتبۂ انسانیت تک اس کا ارتقاع ہو جاتا ہے۔ اور یہی "صراطِ مستقیم" اور "دینِ قیّم" کا آخری مرتبہ ہے .... (یہ) وہ قانونِ ارتقاء ہے جسے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا " (الہلال مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۱۳ء ص)

سُن لیا آپ نے کہ مولانا صاحب اپنے پیرو مرشد گاندھی جی کے متعلق کیا ایمان رکھتے ہیں! اور ان کا مقام کن فلک پیما بلندیوں پہ سمجھتے ہیں!

ہندوؤں کا یہ دعویٰ ہے کہ کانگریس ملک کی "قومی جماعت" ہے۔ اور اس کے سوا اور جتنی جماعتیں ہیں وہ فرقہ وارانہ ہیں۔ ان فرقہ وارانہ جماعتوں کی جدوجہد اپنے فرقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ اس لئے جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے یہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ یہی الفاظ مولانا صاحب کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ لکھا ہے :-

"بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جد و جہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کیلئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں۔" (ص ۲۳)

یعنی جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے وہ فرقہ وارانہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ اب سنئے کہ دورِ آزادی میں مولانا صاحب کیا فرماتے تھے:

"کانگریس کمیٹیاں جو کام کر رہی ہیں ان میں ہندی مسلمان بھی ہندوؤں کے برابر کے شریک ہیں۔ لیکن خالص مسلمانوں کے اندر سرگرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لئے کانگریس کا نظام کافی نہیں۔۔۔۔۔۔ کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں پچاس جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں کہ چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو تو وہ اثر پیدا نہیں ہوگا جو خلافت کمیٹی جمعہ کے دن مسجد میں ایک وعظ کر کے پیدا کر سکتی ہے۔"

(مضامین ابوالکلام آزاد، ستمبر ۱۹۲۱ء)

اس وقت یہ ارشاد تھا۔ آج اگر کوئی جماعت خالص مسلمانوں کے اندر سرگرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے تو اُسے فرقہ وارانہ قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کرنے کا فتویٰ صادر فرما دیا جاتا ہے۔ اور اس پر دعویٰ ہے کہ میں اس مقام سے بول رہا ہوں جہاں دورِ اعتدال میں کھڑا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں جو بنیادی اختلاف ہے اُسے چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

(۱) ہندو اس تمام ملک کو ایک "واحدِ کل" (Single unit) قرار دے کر ایک ایسے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس میں مرکز (Centre) ایک ہو۔ اس نظامِ حکومت کا نام آل انڈیا فیڈریشن ہوگا۔ جو خالصۃً مغربی انداز کے نظامِ جمہوری کے قالب میں ڈھلا ہو۔

اس کے برعکس مسلمان یہ چاہتا ہے کہ ملک کے اس حصہ کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ الگ کر کے وہاں جداگانہ اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

(۲) ہندو تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے وحدتِ قومی (Single Nationality)

کی بنیادوں پر نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ جداگانہ مستقل بالذات قوم قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے مسئلہ کو بین الفرق (Inter-Communal) نہیں بلکہ بین الاقوامی (Inter-National) مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اور دو جداگانہ قوموں کی بنیادوں پر الگ الگ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر وضاحت سے طلوعِ اسلام کے صفحات پر آچکے ہیں کہ ان پر اس وقت مزید بحث ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا صاحب ان مسائل کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

> "ہندوستان کا آئندہ دستورِ اساسی (Constitntion) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا۔ جس کے تمام حلقے (Unit) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہونگے۔ اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہینگے۔ جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ (۳۱ - ۳۲)

یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جو یورپ کی ٹکسالوں سے مضروب ہو کر آیا ہے اور ہندو اسے اس لئے اختیار کرنا چاہتا ہے کہ اس کی رو سے وہ یہاں اپنی اکثریت کی بناء پر خالص ہندو راج قائم کر سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یورپ کی نقالی میں نظامِ زندگی اختیار کرنے کے متعلق مولانا صاحب کبھی کیا فرماتے تھے۔ جمعیۃ العلماء لاہور کے خطبہ صدارت ۱۹۲۱ء کے دوران میں ارشاد ہے۔

> "قوم افراد سے مرکب ہے اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کے لئے ضروری ہے کہ ایک جامع مسلک میں تمام افراد منسلک ہوجائیں اور فرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پر افرادِ قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیاتِ اجتماعی کے لئے کوئی نظام ہمیں دیا تھا یا نہیں؟ اگر دیا تھا اور ہم نے ضائع کر دیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے اسلام کا قرار دادہ جامع نظام کیوں نہ قائم کریں۔"

کیا مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے جس قسم کی جماعتی نظام کے قیام کی تلقین کر رہے ہیں وہ یورپ کی نقالی ہے یا اسلام کا عطا فرمودہ نظامِ حکومت؟ کیا وہ نظامِ زندگی یا طرزِ حکومت کبھی اسلامی قرار پا سکتا ہے جو کفار اور مومنین کی متحدہ قومیت سے وجود میں آئے۔ اور جس میں فیصلے کفار کی اکثریت کے تابع ہوں! ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کس چیز کو اسلامی قرار دے رہے ہیں! کیا یہ وہی چیز نہیں جسے قرآن کریم طاغوتی نظام زندگی قرار دے رہا ہے اور جسے کانگریس نے یورپ کی دریوزہ گری سے حاصل کیا ہے! اس قسم کے فیڈرل نظام میں جہاں مختلف حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہونگے وہاں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت کی کیا حالت ہو گی؟ اس کی بابت پوچھئے ان سیاہ اوراق سے جن پر آپ کی کانگریس کے اڑھائی سالہ عرصۂ حکومت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ اور پھر آپ کس بھولے پن سے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہینگے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا مثلاً بیرونی تعلقات۔ دفاع کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے رکھ سکتا ہے۔ ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے" (ص ۳۲)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بیرونی تعلقات اور دفاع (Defenco) وغیرہ کچھ ایسے اہم مسائل نہیں کہ جن سے خواہ مخواہ کے اندیشے پیدا کئے جائیں۔ یہ "بیرونی تعلقات" جسے اب اکثریت اور اقلیت کے پرفریب سوال کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے، الہلال کے مولانا صاحب کے نزدیک کیا معنی رکھتے تھے۔ سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام!!
اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر
تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے
دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم

پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیِ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو۔ اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظین کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ۔ اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسمِ واحد ہے۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ جسم کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان ہی نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہور کا

جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا:۔

مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم، مثل الجسد، اذا اشتکی لہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمی۔ (الحدیث)

مسلمانوں کی مثال باہمی مودّت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی۔ اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے۔

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے کہ

المؤمن للمؤمن کالبُنیان یشُدُّ بعضہ بعضًا۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔

اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک اوّلین اور اشرف ترین خصوصیت ہے۔ جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (۲۹ : ۴۹)

کافروں کے لئے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت
رحیم اور ہمدرد۔
ان میں جس قدر سختی ہے، باطل اور کفر کے لئے
اور ان کی جس قدر محبت اور الفت ہے حق و صدق اور
اسلام و توحید کے لئے۔ فاعتبروا یا ایھا
المسلمون ولا تکونوا کالذین
قالوا سمعنا وھم لا یسمعون"

یہ ہیں وہ بیرونی تعلقات جن کا آج یوں استخفاف کیا جا رہا ہے۔ سچ ہے یُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا
وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سیاست حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم کے افراد ہیں یا مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندو تمام باشندگان ملک کو ایک "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی قرار دیتا ہے اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس لئے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ لیکن ہندو اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور مسلمان کو ایک اقلیت قرار دیتا ہے۔ مولانا صاحب نے اس باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ ان کی پریشانیِ افکار کا ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے جس کا لفظ لفظ اس کشمکش کا غماز ہے جو ان کے ضمیر اور مصلحت کوشی میں جاری ہے۔ انھیں مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی اس لئے انھیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔

"میں نے اس زمانہ (زمانۂ الہلال) میں بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں کہی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی

اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کردی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کردیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ....

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں تری خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری

تعداد سے کم ہو' لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے۔ اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت' دونوں' اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو' اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (Quality) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ' دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزوری کا اعتراف کرلیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یکجہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بے شبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے' خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار

کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی !

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بناء پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر وہ سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مولانا صاحب کے نزدیک مسلمان اقلیت نہیں۔ اور اگر یہ اقلیت نہیں تو لامحالہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ لیکن ایسا کہنے سے تو ان کی نیشنلزم کی تمام عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ وہ ایسا کس طرح کہیں ! اور کہنا بھی چاہیں تو وہ جن کی نظرِ کرم نے انھیں "راشٹر پتی" کے منصبِ جلیلہ پر فائز المرام کیا ہے۔ وہ ایسا کیوں کہنے دیں ! اس باب میں مولانا صاحب جس مشکل میں جا پھنسے ہیں، ان کی حالت قابلِ رحم نظر آتی ہے۔ اپنے خطبہ کے صفحات ۲۴ تا ۲۶ پر انھوں نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کانگریس نے ہمیشہ اس بنیادی اصول کو سامنے رکھا ہے کہ ہندوستان میں جو دستورِ اساسی بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہئے۔ اور ان تحفظات کے جج خود اقلیت ہوں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"آج بھی اس نے (کانگریس نے) دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا اعتراف کیا ہے ...... کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چُن کر بھیجیں۔"

قارئینِ کرام کو غالباً معلوم ہوگا کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کی اصطلاح گاندھی جی کی وضع کردہ ہے اور اس کی تصریح میں

انھوں نے مسلمان اور سکھوں کا ذکر نمایاں طور پر کیا تھا۔

اب ذرا اس قضیہ کے صغریٰ کبریٰ کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ نتیجہ کیا مرتب ہوتا ہے۔

(۱) مسلمان اقلیت نہیں ہیں ـــــ مولانا صاحب خود بدلائل ویراہین ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) مسلمان ایک الگ قوم بھی نہیں ہیں ـــــ کہ اس طرح دو قوموں کا نظریہ درست ماننا پڑتا ہے جو بقول مولانا صاحب سرکاری داعیوں کا وضع کردہ نظریہ ہے۔

(۳) مسلمان ایک تسلیم شدہ اقلیت ہیں ـــــ کہ یہ مولانا صاحب کے راہنما گاندھی جی کا ارشاد ہے جو مولانا صاحب کے نزدیک وحیِ منزّل سے زیادہ واجب التسلیم ہے۔

تو پھر عقل حیران ہے کہ بالآخر مسلمان ہیں کیا؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

اگر یہ دانستہ فریب دہی نہیں تو خود فریبی کی اس سے زیادہ بیّن مثال بھی مشکل سے مل سکیگی۔

مولانا صاحب نے سب سے زیادہ زور اس امر پہ دیا ہے کہ جب مسلمان اتنی بڑی جماعت رکھتے ہیں تو انھیں اپنے مفاد کے تحفظات کے متعلق ڈرنے کی کیا وجہ ہے! یہ دلیل بظاہر جتنی خوش آئند ہے درحقیقت اتنی ہی زیادہ پُرفریب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ اتنی بڑی جماعت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جس قسم کا نظامِ جمہوری آپ یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں اس میں اتنی بڑی جماعت ایک چوتھائی کی اقلیت بن کے رہ جاتی ہے۔ جب آپ ہندوستان کو ایک کل (Unit) مان لیں اور تمام ملک کا ایک مرکز (Centre) قرار دے کر جمہوری نظام قائم کردیں تو اس مرکز میں مسلمانوں کی حیثیت چوتھائی سے زیادہ بڑھ کس طرح سکتی ہے۔ لہٰذا اکثریت کے فیصلے غیر مسلموں کے فیصلے ہونگے۔ مولانا صاحب! مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں لڑائی آپڑی ہے گنتی ـ جس میں آدمی گنے جاتے ہیں، تولے نہیں جاتے۔ اگر تولے جانے کا مسئلہ ہوتا تو پھر ڈرنے کی کیا بات تھی!

اب اس اہم موضوع پر آیئے۔ جو اس تمام خطبہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمان ایک الگ قوم نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جزو لاینفک ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (**Factor**) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک کے بعد دوسرا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی۔ اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک حجازی قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کیلئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔" (صفحہ ۳۶)

(۱) "کانگریس جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے۔ ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔" (صفحہ ۲۴)

(۲) یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے (صفحہ ۲۹-۲۸)

"متحدہ قومیت" کے اس اصول کی وضاحت مندرجہ صدر الفاظ میں کی گئی ہے۔

اس مرصع غزل کا آخری شعر بھی سُنتے جائیے۔ فرماتے ہیں :-

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضا مند ہونا چاہیے۔ اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔" (ص ۳۹)

اللہ اکبر! کفار اور مسلمان ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے ایک ناقابلِ تقسیم قوم بن جاتے ہیں! کفر و اسلام ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک نئی تہذیب میں تحلیل ہو سکتے ہیں! یہ قدرت کا اٹل قانون ہے! یہ تقدیر کا فیصلہ ہے! اس پر قسمت کی مُہر لگ چکی ہے۔ اس متحدہ قومیت کو خود دستِ قدرت نے تیار کیا ہے! مُسلم و کافر کی علیحدگی کا تخیل بناوٹی ہے!!

یا اللہ! یہ ہم کیا سُن رہے ہیں! اور کس سے سُن رہے ہیں!

یہ وہ آواز سُن رہے ہیں جس کے مٹانے کے لئے حضرت آدمؑ سے لے کر حضور خاتم النبیینؐ تک انبیاء کرام کا پورا سلسلہ پیغامِ خداوندی کو لے کر ظلمت کدہ عالم میں آتا رہا۔ اور سُن رہے ہیں اس شخص کی زبان سے جس کی ساری اسلامی عمر اس پیکار میں گذر گئی کہ یاد رکھو۔ قومیت پرستی کی یہ آواز بلا شائبۂ تشکیک شیطان کی آواز ہے۔ اس کے فریب میں آ جاؤ گے تو سیدھے جہنم کے عمیق گڑھوں میں جا گروگے۔ اور ہاں! بدبختی یہ کہ یہ آواز اس کی زبان سے سُن رہے ہیں جو آج بھی دعویٰ کرتا ہے کہ

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔" (ص ۳۶)

ہم حیران ہیں کہ کفر و باطل کے اس اسلام سوز نظریہ کی تردید میں الہلال کے کتنے اقتباسات پیش کریں۔ اس کے تو پورے کے پورے مجلدات اس ایک دعوت کے نقیب ہیں کہ

"مسلمانوں کی قومیتِ صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے" (خطبۂ صدارت مولانا آزاد، ستمبر ۱۹۲۱ء)

اس کا تو ایک ایک ورق۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اس دجل و فریب کی دھجیاں بکھیرنے کیلئے تھا کہ دنیا نے جس قدر قومیتوں کی بنیادیں وضع کی ہیں سب ابلیسانہ حیلہ کاریاں ہیں۔ مسلمانوں کی قومیت کا مدار صرف مذہب ہے۔ اللہ کا قانون ابدی ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ہم فی الواقعہ متحیّر ہیں کہ کون کون سے اقتباسات پیش کریں اور کہاں کہاں کے حوالے دیں۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ کیجئے ــــ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ انبیاء کرام کا سلسلۂ رشد و ہدایت اسی دعوت کے نشر و اشاعت کے لئے دنیا میں قائم ہوتا رہا ہے کہ وہ انسانی رشتۂ قومیت کے ان تمام غیر فطری معیاروں کو منہدم کر دے جو رنگ۔ نسل۔ وطن کی بولہبی تصوّرات سے وضع ہوتے ہیں اور ان کی جگہ صرف ایک معیار قومیت کو باقی رکھے جو اللہ کا متعین فرمودہ ہے۔ اور وہ معیار حقہ ہے اشتراک عقائد۔ یعنی مذہب۔ عہد اسلامی کے مولانا آزاد اس باب میں فرماتے ہیں :-

"قرآن حکیم میں اگرچہ نبوت کے عام اشتراک جنس کی بناء پر تمام انبیاء کرام کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت سے آیا ہے۔ لیکن بعض خصوصیات نوعی کے لحاظ سے اس نے انبیاء کے جو مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں ان میں دو سلسلے عام طور پر ممتاز نظر آتے ہیں :-

ایک سلسلہ ان انبیاء مؤسسین کا ہے جنھوں نے اپنی دعوت کے ذریعہ نئی قومیتوں کی بنیاد ڈالی اور جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ از سرِ نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لئے آتے تھے ــــ دوسرا سلسلہ انبیاء مجددین و محدثین (بالفتح) کا ہے۔ جنھوں نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ امتِ صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی۔ یا امتداد عہد کے نتائج مفسدہ و استیلا کے بدعات و محدثات سے اسے نجات دلا کر فرض تجدید و احیاء ادا کیا۔

پہلے سلسلہ کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ تمام قدیم نظام۔ قدیم عقائد اور قدیم اخلاق

ومقومات کو مٹا کر ایک جدید قومیتِ صالحہ کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود طبعیہ کے اثر سے الگ کرکے صرف مذہبی آب و ہوا میں ترقی اور نشو و نما دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں خدا تعالیٰ نے اس صنف کے ایک نمایاں سلسلے اور اس کی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیائے کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازاتِ قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر ان کی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقتور حربہ تیار کریں۔ اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعیِ الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا۔ اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا۔ جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیائے کرام و رسلِ عظام کے اس سلسلہ میں جنھوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے۔ اور چونکہ ان کی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی اس لئے ضرور تھا کہ اس اولین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمھارا بیٹا عملِ صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جس کی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمھارا عزیز تھا۔ لیکن اس نے عملِ صالح کی جگہ عملِ غیر صالح سے رشتہ جوڑا۔ پس اب اس کا ذکر بیکار ہے۔ اور یہ بنائے قومیت کا وہ ناموسِ الٰہی ہے جس کا تمھیں علم ہونا چاہیے۔"

قَالَ رَبِّ اِنِّیٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ - حضرت نوح نے عرض کیا اے میرے پروردگار میں اپنے ضعف بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی میں نے اس کی نسبت تجھ سے سوال کیا!"

پھر ارشاد ہے :-

"حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی امت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اگرچہ ضلالت عصر اور جہل انسانیت اس سے دست و گریبان رہی اور اس لئے مَآ اٰمَنَ مَعَہٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ (۱۱-۱۶) ان پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی مگر ایک چھوٹی جماعت کو، تاہم جس امت صالحہ کی اس عہد اولیٰ میں بنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی اور خدا کا کوئی حکم دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوح پر بہت کم لوگ ایمان لائے۔ کیونکہ انسانی مدنیت و عمران کا بالکل عہد طفولیت بلکہ اس سے بھی متقدم تر دور تھا۔ اور مذہب کا سلسلہ ارتقاء ابھی ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے مصدقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لے گئی۔

یہ درصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوح کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لئے نہ تھی، بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں کے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوت دینی پر قائم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوراء رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے۔ اور زمین کا ہر ٹکڑا نوع انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔"

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں، آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ خود انبیاء کرام علیہم السلام جس قومیت کی تاسیس کے لئے تشریف لاتے رہے کیا وہ وہی قومیت ہے جو اشتراک وطن سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اور مولانا صاحب

جس کے آج اس مخزو مسرت سے لانیفک عنصر بننے کا اعلان فرماتے ہیں یا یہ وہ قومیت ہے جسے مٹانے کے لئے یہ سلسلۂ رشدو ہدایت جاری رہا تھا!

آپ کوئی کفر کو اسلام کہنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟

یہ الہلال کے مولانا آزاد تھے اور آج کے مولانا آزاد قومیت کا معیار وطن کی چار دیواری قرار دے رہے ہیں۔

الہلال والے ابوالکلام لکھتے ہیں:-

"انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لئے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لئے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں۔ بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی۔ اور کہا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔

اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا۔ اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لئے کہ باہم پہچانے جاؤ۔ ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز اور شرف اسی کے لئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب زیادہ متقی ہے۔

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے "وَمِنْ آيَاتِهِ اخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ" لیکن وہ اس کو کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔

اصلی رشتہ صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے۔ پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۔ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (۲۳ : ۵۵)

بے شک تمھاری جماعت ایک ہی اُمت ہے اور ہم ایک ہی تمھارے پروردگار ہیں۔

اے برادرانِ ملت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور دعوتِ اسلام کی وحدت تھی جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستانِ حجاز میں ظہور کیا۔ مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبلِ بوقبیس کی گھاٹیوں سے اُٹھی۔ مگر دیوارِ چین سے صدائے اشھد ان لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظر میں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروانِ اسلام کے نقشِ قدم گن رہی تھیں عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سیکڑوں ہاتھ تھے، جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لئے وضو کر رہے تھے وہ تمام دُنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے جن کو شیطانِ رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن خدائے رحیم نے ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعے پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور ان کے روٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریکِ رنج و راحت ہو گئے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۝ (۳ : ۹۸)

اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو' جو تم پر نازل کی گئی' جبکہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں اُلفت و محبت پیدا کر دی' اور دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔

"یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا' بمجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو' خواہ الجریا کا وحشی ہو' خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دُنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دُنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہدِ مودت۔ خون اور نسل سے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبت ٹوٹ جائیں۔ مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے' ایک عرب کے بدو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نومسلم کو مکہ معظمہ کے صحیح النسب قریشی سے پیوست و یک جان کرتا ہے' دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے۔ جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا ہے۔" (الہلال ۱۷ر نومبر ۱۹۱۲ء)

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم چاہیں تو اس موضوع پر صفحات کے صفحات' الہلال وغیرہ سے پیش کرتے جائیں۔ لیکن عدم گنجائش زیادہ طوالت کی مانع ہے۔ اس لئے اس عنوان پر مزید اقتباسات سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہوئی تو انشاءاللہ کبھی پھر سہی۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے ہمارا شائع کردہ پمفلٹ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی" ملاحظہ فرمایئے۔ اس وقت ضمناً دو تین باتیں اشارۃً عرض کرنا ضروری ہیں۔ متحدہ قومیت سے

مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے نظام جمہوری میں اُمورِ مہتمہ کے فیصلے مسلم و غیر مسلم دونوں کی مشترکہ اکثریت سے نفاذ پذیر ہوں گے۔ مسلمانوں کی خالص جداگانہ اکثریت کا اس میں کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت معیارِ فیصلہ قوم کی اکثریت ہوگا نہ کہ مسلمانوں کی اکثریت۔ اس لئے کہ جب دونوں مل کر ایک قوم ہو گئے تو پھر ان کی الگ الگ ہستی کا سوال ہی باقی نہیں رہتا لیکن دیکھئے کہ الہلال والے مولانا آزاد اس باب میں کیا فرماتے تھے:۔

"اسلام میں حقِ امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دُنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہ۔ تو اس کے احکام دینیہ کیونکر تابع آرائے اشخاص و جماعتِ مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس لئے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے یا پھر دُنیوی اُمور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبارت ہے" (الہلال ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۳ء)

آج ہم سے کہا جاتا ہے دینی اُمور میں فیصلے مسلمانوں کی اپنی اکثریت سے ہونگے اور دنیاوی امور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قوم کی اکثریت سے۔ لیکن خود مولانا صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ دُنیاوی اُمور میں بھی مسلمانوں کے فیصلے "وہ اجماع کر سکتا ہے جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبارت ہو" اس لئے کہ اسلام میں مذہب و سیاست۔ دین و دُنیا کوئی الگ الگ شئے نہیں ہیں۔ ان میں تو باہمی ایسا التزام و امتزاج ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ اب فرمایئے کہ مولانا صاحب کی "متحدہ قومیت" کی اکثریت کے فیصلے مسلمانوں کے نزدیک کس طرح قابلِ قبول ہو سکتے ہیں!

یہ ہیں وہ مولانا صاحب جن کا دعویٰ ہے کہ میں آج بھی الہلال کے مقام سے بول رہا ہوں۔ انھیں تو چاہئے تھا کہ اپنے خطبہ صدارت سے پہلے فرماتے کہ ہم واردھا کے ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ ابھی آپ کو مہاتما گاندھی کا ایک ریکارڈ سنایا جائے گا۔

پھر مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصور "سرکاری دماغوں" کا

پیدا کردہ ہے۔ قومیت پرست حضرات کا یہ ایک پرانا مرض ہے کہ جس کسی سے اختلاف ہوا جھٹ کہہ دیا کہ وہ گورنمنٹ کا آدمی ہے۔ سرکار پرست ہے۔ ٹوڈی ہے۔ دشمنِ آزادی ہے۔ اور اسے یوں بگو بنا کر اصل موضوع سے الگ ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ اس باب میں مولانا صاحب بھی اسی بازاری سطح پر اُتر آئے۔ جب اور کوئی دلیل نہیں سُوجھی تو کہہ دیا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا خیال سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ صفحاتِ گذشتہ میں مولانا صاحب کی تحریروں سے جو اقتباسات پیش کئے جا چکے ہیں ان سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصور سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے یا یہ تخیل سرکارِ مدینہ۔ رحمتِ دو عالم۔ حضور رسولؐ کافۃ للناس پر نازل شدہ ضابطۂ خداوندی نے متعین فرمایا ہے۔ وہی چیز جو الہلال کے دور میں عین قرآنی تھی۔ اصل اسلام تھی۔ آج سرکاری دماغوں کا وضع کردہ" بتائی جاتی ہے! ذرا سوچئے کہ سرکاری دماغوں کا پیدا کردہ" مسلمانوں کی جداگانہ قومیت" کا تصور ہے یا اس قومیت کا تصور جسے مولانا صاحب اشتراکِ وطن کے یورپی معیار کے مطابق اب متشکل فرما رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جغرافیائی حدود کی بناء پر تخلیقِ قومیت کا نظریہ یورپ کا پیدا کردہ ہے اب دیکھئے کہ اس نظریہ کی طرف دعوت دینے والوں کے متعلق مولانا صاحب کا کیا ارشاد تھا۔ البلاغ جلد ۱ نمبر ۲ کے عربی افتتاحیہ میں فرماتے ہیں:۔

" وصاح بهم خطيب فتنة الافرنجية، ان لا حياة لكم بالرابطة الاسلامية۔ لانها ممقوتة فى نظر اهل مدنية الغربية وما اعتزبه المسلمون الاولون من آداب القرآن۔ فقد نسختها مدنية اوربا فى هذا الزمان۔ فالافرنجية! الافرنجية! الزموها تكونوا من الفائزين۔ والقومية القومية! اعلنوها ان كنتم مؤمنين ...... فاولئك حزب الشيطان۔ الا ان حزب الشيطان هم الخاسرون (۱۹:۵۸)

(ترجمہ) اور فرنگیت کے خطیب پکار پکار کر چلا رہے ہیں، کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو مغربیت کی پیروی کرو۔ تمہاری حیات "رابطۂ اسلامی میں نہیں۔ اس لئے کہ مغربی تمدن کی نظروں میں رابطۂ اسلامی کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اور مسلمانوں نے ازمنۂ گذشتہ میں جو قرآن کریم کی پیروی سے عزت و وقار حاصل کیا تھا تو وہ چیز اس زمانے میں کار آمد نہیں۔ اسے یورپین تمدن نے منسوخ کر دیا۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر فائز المرام ہونا چاہتے ہو تو فرنگیت کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور قومیت پرستی کا زور و شور سے اعلان کرو اگر تم ایسا نہ کرو گے تو۔

لیکن یہ لوگ شیطان کے گروہ میں سے ہیں۔ اور یاد رکھو شیطان کا گروہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہیگا۔

آج مولانا صاحب اشتراکِ وطن کی بنا پر متحدہ قومیت میں تمام مصائب کا حل بتاتے ہیں۔
لیکن یہی مولانا صاحب اپنے اسلامی دَور میں فرماتے تھے کہ

"ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی قوم کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب، یا بالفاظِ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی "بنیاد" مذہب کو قرار نہیں دینگے اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہوگی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے مسلمانوں کیلئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس حق کے مقابلہ میں

اگر کوئی لفظ ہے تو "خدا یا اسلام" ہے۔"

اس وقت مسلمانوں کی روح کو گرمانے والے الفاظ "اسلام" اور "خدا" کے تھے۔ آج اس کے اندر حرارت پیدا کرنے کے لئے آتشکدۂ وطنیت کا راستہ بتایا جا رہا ہے؛ اس وقت کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی کوئی قومیت زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق نہیں رکھتی اور آج اپنی جغرافیائی تقسیم پر قائم شدہ قومیت کو قدرت کا فیصلہ بتایا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس قسم کے غیر اسلامی "متحدہ قومیت" کا اثر کیا ہوتا ہے خود مولانا صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ اپنے خطبۂ صدارت کے صفحات ۲۹۵-۲۹۶ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گذری ہوئی تہذیب معاشرت

> کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے یہی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (Revival) مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔ "

ذرا الفاظ کی سحر طرازی ملاحظہ فرمائیے۔ " ایران اور وسط ایشیا " لکھ کر مولانا صاحب نے نہایت سادگی لیکن پرکاری سے ایک اہم اعتراض سے بچ نکلنے کی کوشش کی ہے گویا انھوں نے ظاہر یہ کرنا چاہا ہے کہ وہ اس تہذیب و معاشرت کی تجدید کے خلاف ہیں جو مسلمان عجم سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اسلامی تہذیب و معاشرت کے خلاف نہیں۔ لیکن مولانا صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ صرف " ایران و وسط ایشیا " کے دو لفظ لکھ دینے سے آپ اپنے دامنِ تقدس کو بچا کر نہیں نکل سکتے۔ ذرا ان الفاظ کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ آپ زبان۔ رسم و رواج۔ شعر و ادب۔ معاشرت۔ ذوق اور روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتوں کے متنوع گوشوں میں سے کسی ایک گوشہ کے لئے بھی اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمان یہ تمام کی تمام چیزیں وسط ایشیا اور ایران سے ہی اپنے ساتھ نہیں لائے تھے بلکہ ان کے تمدن و تہذیب کی آب و گل میں خاکِ پاکِ حجاز کا بھی کافی عنصر شامل ہے اور مسلمان اپنی عجمی تہذیب کا احیاء نہیں بلکہ خالص اسلامی تہذیب کا احیاء چاہتے ہیں جس کی نسبت مولانا صاحب کبھی فرمایا کرتے تھے :۔

> " میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت و حصولِ عظمتِ ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی " تاسیس " کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تجدید کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و

وجواہر کو نظرِ حسرت وطمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہیے۔ جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی۔"

مولانا صاحب کا ارشاد ہے کہ ہندو اگر اپنی ہزار سالہ پیشتر کی تہذیب کا احیاء کرنا چاہتے ہیں، تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وہ خواب ہے جو کبھی پورا نہ ہوگا۔ گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ متحدہ قومیت میں ہندو بھی اپنی پرانی تہذیب کو دوبارہ رائج نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ہر وہ شخص جس کی نگاہوں سے اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت سلب نہیں کر لیا، اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے کہ ہندو اپنی اس تہذیبِ کہنہ کا کتنا بڑا حصہ اس وقت تک ملک میں رائج کر چکے ہیں اور بقیہ کی ترویج وتنفیذ میں کس شدت سے کوشاں ہیں۔ کیا کانگرس کا اڑھائی سالہ دورِ حکومت محض اسی مقصد کے حصول میں صرف نہیں کیا گیا کہ کسی طرح پراچین کی پرانی تہذیب کا احیاء کیا جائے۔ اور سب کو چھوڑیے۔ ایک زبان ہی کو لیجیے۔ دیکھیے کہ اس دو تین سال کے عرصہ میں وہ کیسے کیا ہو چکی ہے اور کیا ہوتی چلی جا رہی ہے حتیٰ کہ خود "ابوالکلام" بھی "چناؤ" اور "سبھاؤ" جیسی پرشتو نما زبان لکھ رہا ہے۔ اور اس پر بھی مسلمانوں کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نہیں، فکر نہ کرو۔ ہندو اپنی پرانی تہذیب کو رائج نہیں کر سکتے! دور کیوں جائیے مولانا صاحب سے صرف اتنا پوچھیے کہ جس کانگریس نگر سے آپ ابھی ابھی تشریف لا رہے ہیں وہاں آپ نے کیا منظر دیکھا! کیا اس میں پراچین تہذیب کی کوئی جھلک آپ کو نظر نہیں آتی تھی۔ جناب خود صدر سے "راشٹرپتی" بن چکے ہیں اور اس پر بھی آپ کو پراچین تہذیب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

خضر کیونکر بتائے۔ کیا بتائے؟

اگر ماہی کہے۔ دریا کہاں ہے!

اب حضرت مولانا صاحب کے خطبۂ صدارت کے مقطع کا بند بھی سنئے۔ سننے اور سر پکڑ کر بیٹھ جائیے کہ یا اللہ! جب کوئی شخص تیرے پیامِ ابدی سے مذاق کرتا ہے تو اس کا کیا حشر ہو جاتا ہے! فرماتے ہیں اور وہی مولانا صاحب فرماتے ہیں جو ابھی ابھی اعلان فرما رہے تھے کہ "میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں"۔ کہ

"آج ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے :-

(۱) اتحاد

(۲) ڈسپلن اور ــــــ اور (سنئے - سنئے - ذرا کلیجہ تھام کر سنئے)

"مہاتما گاندھی کی راہنمائی پر اعتماد - یہی ایک تنہا راہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا - اور اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔" (صہ۳۹)

پھر سنئے ان الفاظ کو

"یہی ایک تنہا راہنمائی ہے"

یہ مولانا صاحب کا ایمان ہے - اور قرآن کا ارشاد ہے کہ

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳/۷۳)

کہدے کہ راہ نمائی صرف ایک ہے - اور وہ اللہ کی راہ نمائی ہے -

ایک انسان کی راہ نمائی - اور پھر انسانوں میں سے بھی ایک غیر مسلم کی راہ نمائی ! استغفر اللہ ربی من ھفوات الشیطان -

سنئے کہ دورِ اسلامی کے مولانا آزاد اس قسم کی راہ نمائی کے متعلق کیا فرماتے تھے - ارشاد ہے -

"اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے - اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے - کہ اس کے پیروؤں کو پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے - مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں - ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں - وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنیوالے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں - وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے آگے کھڑی ہو جائے گی - ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے - راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں - خدا ان کو طلب کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو

جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔"

لیکن غیروں کے آگے سر اسی وقت جھکتے ہیں جب انھیں وسیلۂ حاجات سمجھ لیا جائے۔ جب انھیں "ان داتا" قرار دے لیا جائے۔ آخ۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کوتاہی کیا! یہاں تو بازو ہی ٹوٹ گئے۔

وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ۔ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے (زمین کی پستیوں پر) آ گرا۔ اسے کوئی (پنجے دار) بڑا پرندہ اُچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا (تیز جھونکا) اسے (پرِکاہ کی طرح) کسی دور دراز مقام کی طرف اُڑا کر لے گیا۔

مولانا صاحب کبھی فرماتے تھے۔

"البتہ بطور تحدیثِ نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھکو یہ راہ سوجھائی کہ مسلمانوں کے پولیٹیکل نصب العین کو بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ اور ان کو اس راہ میں بھی از روئے مذہب قدم رکھنا چاہیے۔ نہ کہ باتباعِ حریتِ جدیدہ یورپ وتقلیدِ اخوانِ وطن۔ پھر یہ اس کا ایک فضل ہے اور اس میں گلے شکوے کی گنجائش نہیں۔ آج چالیس برس سے مسلمان پالٹیکس پر انکار یا اصرار کے لحاظ سے بحث کر رہے ہیں! لیکن براہِ کرم بتائیے کہ آج تک ایک صدا بھی تمام اسلامی ہند میں اس کی بلند ہوئی ہے؟ آج تک مسلمانوں نے اور ان کے تمام لیڈروں نے پولیٹیکل آزادی کو ہمیشہ ہندوؤں کی آرزو اور یورپ کے نئے آزادانہ دور کا نتیجہ سمجھا لیکن کسی نے اس پہلو پر نظر نہ ڈالی کہ خود اسلام بھی مسلمانوں کو ان کی سیاست کے لئے کوئی بلند جگہ

دیتا ہے یا نہیں۔ اس کا دعویٰ کس کو ہے کہ نئی بات دکھلا دی، البتہ ایک کھوئی ہوئی بصارت تھی جو اب واپس آگئی۔" (الہلال ۱۰ دسمبر ۱۹۱۲ء)

لیکن افسوس کہ یہ بصارت مستقل طور پر مولانا کے پاس نہ رہی سکی اور مولانا صاحب نے جا کر خدا سے وار دھا کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ اور خود اس کی لاٹھی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۔ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔ (۲: ۱۶-۱۷)

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ لیکن اُن کی تجارت اُنھیں کوئی نفع نہ دیگی۔ یونہی راہ راست کھو بیٹھے۔ ان کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص آگ جلائے اور جب اس سے اس کا ماحول روشن ہو جائے تو اللہ اس کی روشنی سلب کر کے لے جائے۔ اور وہ پھر اندھیرے میں اندھوں کی طرح رہ جائے (کہ دوسروں کی لاٹھی کا سہارا ڈھونڈھتا پھرے)

وہی کفار جن کی راہ نمائی پر اعتماد کی تلقین کی جا رہی ہے کبھی ان کے متعلق ارشاد تھا۔

"کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں۔ نقضِ امن کرتے ہیں اور پھر اُس کو حفظ امن کا لباس پہناتے ہیں قتل کرتے ہیں اور اُسے جاں بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی ٹیک میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور بتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرمانبرداری جرم ہے۔ گناہ ہے موجب عذاب ہے۔ اس قلاوے کو توڑ دینا چاہیے۔ اس اطاعت سے تبرّی فرض ہے۔ اسیس فرمانبرداری پہ نافرمانی کو ترجیح ہے۔ اُن کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں۔ خوشامد کریں ریاکاری کریں۔ منافقت کریں تو انھیں بھی اظہار نفاق کا موقع ملے۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کیلئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے؟ کفار کے عہد و پیمان کا تمھیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔

آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انھیں لحاظ تک نہیں، قسمیں کھاتے ہیں، حلف اُٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ .... [1] پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرطِ دولت و کثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔" (الہلال ش ۲۷ ۱۹۱۳)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:۔

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں۔ جنھیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرتِ کاملہ کوئی اور انتظام کر دیگی۔ اسوقت معلوم ہوگا کہ الآن قد ندمت ولا ینفع الندم۔ اس وقت تم نادم ہوئے جب ندامت مفید ہی نہ رہی" (مضامین آزاد حصہ سوم)

کہاں تک لکھتے چلے جایئے۔

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

---

[1] یہاں مولانا صاحب نے کفار کو بد اصل اور بد اطوار تک لکھدیا ہے۔ ہم نے یہ حذف کر دیا ہے۔ منہ

آنکھوں والے کے لئے اتنا ہی کیا کم ہے۔ وہ یہ کچھ دیکھ کر یقیناً متعجب ہوگا کہ با لآخر کیا بات ہے کہ مولانا صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے آج گمراہی و ضلالت کے اس قدر عمیق گڑھوں میں جا گرے ہیں اور اپنے ہی گرنے پر اکتفا نہیں۔ قوم کو بھی اسی جہنم کی طرف بلاتے جا رہے ہیں۔ یقیناً یہ سوال فطری طور پر آپ کے دل میں پیدا ہونا چاہیے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں خود مولانا صاحب سے سنئے۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے تو اس کی مقدم کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے سوچنے والے دماغوں اور دیکھنے والی آنکھوں کو اپنے قابو میں کر لے۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ زمانہ کی شہادات آپ کے روبرو ہیں انھیں دیکھئے اور غور کیجئے کہ دنیا کس طرح اس اصولؐ پر عمل پیرا ہوتی چلی آرہی ہے یذبحون ابناءھم (بنی اسرائیل کے بیٹوں کا قتل) کچھ فرعونِ مصر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا۔ دنیا میں ہر مستبد قوت اس قسم کے قتل کرتی چلی آئی ہے اور کر رہی ہے۔ فرق صرف آلاتِ قتل و ذرائع اتلاف میں ہے۔ یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ ہندو نے جب یہاں مسلمانوں کو غلام بنانے کی ٹھانی تو انھوں نے بھی سب سے پہلے اسی حربہ کو استعمال کیا اور مسلمانوں میں یذبحون ابناءھم شروع کر دیا۔ ملتِ اسلامیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے کچھ ایسے تھے جو ہندوؤں کے دامِ فریب سے بچ کر نکل بھاگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دنیا میں زنجیریں صرف لوہے کی ہی نہیں ہوتیں اور چیزوں کی بھی ہوتی ہیں۔ سنئے کہ مولانا صاحب کیا فرماتے ہیں۔

"سالکِ راہِ حریت و صداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آئندہ کے منازل طے نہ کر سکے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے۔ وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ و رسم منزل صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ سے لیکر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امیدِ زر اور طمعِ جاہ!

لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حُبِ مال اور الفتِ زر کے لئے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شئے کے لئے

حق و صداقت کی ابدی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے۔ وہ چاندی سونے کے سکّوں کو اگر خدا کے لئے اور اس کی سچائی کے لئے کھو دے تو خدا اُسے سچائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے پر جو خدا کی محبت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ انسان آسمان کی سب سے بڑی عزت کو زمین کی سب سے بڑی ذلت کے لئے کھو دے؟

کتنے بڑے بڑے تاجدار پرہیبت فاتح، عظیم الشان سپہ سالار، نامور محب وطن اور محبوب القلوب دولت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا۔ انھوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی فوج اور در اصل اپنے خدا اور اس کی صداقت سے غداری کی، اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو، اور شیطان کے تخت کی زیب و زینت کے لئے خدائے رحمٰن کے دربارِ جلال کی عزت و عظمت کو چھوڑ دیا!
تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی درد کے ماتمی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ اسی ناپاک سرگذشت پرخون کے آنسو بہاتی ہیں اور دولت پرستی کی ملعون نسل آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لئے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ رہی ہے فی الحقیقت راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی کی چمک اور سونے کی سُرخی ہی ہے اور اگر اس منزلِ پرخطر سے تم گذر گئے تو پھر تمھاری ہمت بے پروا اور تمھارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے۔ یہی طمع کا خبیث دیو ہے جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے اسی نے فرزندانِ ملت سے غیروں کے آگے مخبری کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابناءِ وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پہ اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے

کیچڑ میں گرا دیا ہے۔ تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی نے بڑے بڑے مدعیانِ خدمتِ ملک و ملت کی برسوں کی کمائی ایک آن کے اندر ضائع کر دی ہے۔ اور انھیں چارپایوں کی طرح گرا دیا ہے تاکہ برسوں کی سچائی کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کر دیں۔ آہ! یہی انسانیت کے لئے وہ روحِ خبیث ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے پُر از علم و عمل دلوں کے اندر حلول کر گئی ہے۔ اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے، اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔

آہ! ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا قلب خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا ہے۔ ہاتھوں میں قلم کانپ رہا ہے! کہ اے اللہ! جو تیری درگاہ سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے! اے مالک الملک صدقہ اپنی رؤف الرحیمی کا! غربت و افلاس، بھوک اور پیاس کی زندگی دیدینا۔ لیکن طمع جاہ و ہوسِ زر کی نظر فریب افسونگرانہ کشش و جاذبیت سے بچائے رکھنا۔ کہ جو اس سحر سے مسحور ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ اور جو تیرے در سے ٹھکرا دیا گیا اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ لغزش تو ہر ایک کی خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن ایک عالم کی لغزش تو وہ ہے جس کے متعلق خود نبیِ اکرمؐ نے فرمایا کہ

"میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن باتوں سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہیں

(۱) عالم کی لغزش

(۲) منافق کا قرآن سے استدلال

(۳) اور گمراہ کرنے والے سردار (لیڈر)

کہتے ہیں کہ حضرتِ امام اعظمؒ ایک دن بازار سے گزر رہے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اور راستہ میں

کیچڑ تھی۔ ایک لڑکا ادھر سے گذرا تو آپ نے فرمایا کہ بیٹا! احتیاط سے چلو۔ قدم نہ پھسل جائے۔ گر جاؤ گے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور آپ کو پہچان کر کہا کہ حضور! میرے گرنے کی فکر نہ کیجئے۔ اپنا آپ کو سنبھالئے۔ میں گرا تو خود ہی گروں گا۔ اور اگر (خدا نکردہ) آپ گر گئے تو ساری دنیا گر جائے گی۔

کس قدر صحیح تھا اس بچے کا یہ تبصرہ۔ زید و بکر گمراہ ہوں تو ان کی گمراہی ان کی ذات تک محدود رہیگی۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب صحیح راستہ چھوڑ جائیں تو پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبیں۔ ایک لیڈر کی یہی لغزش ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ
دَارَ الْبَوَارِ۔ جَهَنَّمَ ‏ $\frac{14}{28}$

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا۔ جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناسپاسی سے بدل دیا۔ اور اپنی قوم کو تباہی و بربادی کے جہنم میں لے گرے۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قوم بروقت متنبہ ہو گئی اور جہنم میں گرنے سے بچ گئی۔ اے کاش آج بھی اللہ تعالیٰ ان جہنم میں گرنے والوں کی چھنی ہوئی بصارت انھیں واپس دیدے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ فریب نفس نے انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ بشرطیکہ دلوں اور آنکھوں پر مہر ہی نہ لگ چکی ہو۔ وَمَن يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے
مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

(اقبالؒ)

نقد و نظر

کانفیڈریسی آف انڈیا (بزبان انگریزی) مصنفہ "اے پنجابی" ناشر نواب سر شاہنواز خاں صاحب والئے ممدوٹ۔ ممدوٹ ولا۔ ڈیوس روڈ۔ لاہور۔ صفحات ۲۷۲۔ معمولی ایڈیشن کی ۴ ہزار کاپیاں نواب سر شاہنواز خاں صاحب کی عنایت سے مفت تقسیم ہو رہی ہیں۔ عمدہ ایڈیشن کی قیمت ایک روپیہ ۸ ؍ رکھی گئی ہے۔ یہ کتاب حضرت علامہؒ کے شعر ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد ؟
گفتم کہ نمے سازد ! گفتند کہ برہم زن !

کی ہندوستان میں سیاستِ اسلامیہ کے نقطۂ نگاہ سے ایک آئینی تفسیر ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے ملتِ اسلامیہ کے مختلف النوع علل و عوارض کا۔ اسکے گذشتہ کارناموں کا۔ کانگریس کے ساتھ تعاون اور اسکے نتائج کا۔ مسلمانوں کے سیاسی جمود کا اور سب سے بڑھ کر انکے ایک الگ تھلگ قوم ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں انکی آئندہ سلامتی کا یہ علاج بتلایا ہے کہ اس ملک کو بلحاظ آبادی پانچ خطوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تفصیل اس اجمال کی میاں محمد رفیق صاحب کے اس مضمون میں ملے گی جو مارچ کے پرچے میں شائع ہو چکا ہے۔

فاضل مصنف نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنی تجاویز کو دلائل سے مستحکم کیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں تکرار بھی پایا جاتا ہے کہ ایسی تصنیف میں تکرار بعض مواقع پر ناگریز ہو جاتا ہے فاضل مصنف نے اس کتاب میں اسلامی معلومات کا ایک قیمتی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اسی نوع کی دوسری تصانیف مثلاً سید عبد اللطیف صاحب کی "کلچرل زون" کی اسکیم ریجنل فیڈریشن کی اسکیم اور مسٹر اسد اللہ کی اسکیم بھی مصنف کے سامنے تھیں اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ اسکیم کو ان تمام مشکلات اور اعتراضات سے منزہ رکھنے

کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مصنف کی نگاہ میں ان اسکیموں کو قابل عمل بنانے میں حائل ہیں۔

یوں تو جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے۔ یہ کتاب معلومات مفیدہ کا ذخیرہ ہے لیکن بعض باتیں تو اس میں ایسی آگئی ہیں جو افادیت کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ مثلاً اس میں بتلایا گیا ہے۔ کہ اقتصادی طور پر شمال مغربی زراعتی خطہ باقیماندہ ہندو صنعتی خطہ کی ضد ہے اور اس کے ثبوت میں مسٹر کیلورٹ ایسے بلند پایہ ماہر اقتصادیات کی پنجاب کے متعلق ایک مشہور تصنیف سے اقتباسات درج کئے گئے ہیں پھر خاص کر مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ گذشتہ ۱۹۱۹ء اور موجودہ (۱۹۳۵) کی اصلاحات بیشتر مسلمانوں کی جنگ عظیم میں انگریزی سلطنت کی حمایت میں جانی قربانیوں کا نتیجہ ہے نہ کہ کانگریس کی شورش پسندی کا یہ چیز انہوں نے اس جامعیت سے لکھی ہے۔ کہ اس سے اس غلط فہمی کا فوری ازالہ ہوجاتا ہے کہ موجودہ اصلاحات کانگریس کی ہنگامہ آرائیوں اور انہی کی تحریکات عدم تعاون اور سول نافرمانی ایسے محارب کی شرمندۂ احسان ہیں۔ یہ فقرہ خاص طور پر ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ۔

"جنگ عظیم میں مسلمانوں کا تو خون بہ رہا تھا اور ہندو جلب منفعت میں مصروف تھے"

اس کے علاوہ فاضل مصنف نے مشہور مورخ فرشتہ کی تاریخ۔ ملا عبدالحمید لاہوری کے شاہ جہان نامہ اور مورخ خافی خاں کی تاریخ سے اقتباسات درج کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ محض زمانہ حاضرہ کی پیداوار نہیں۔ بلکہ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں بھی جب کہ مسلمان اس سرزمین پر حکمران تھے۔ باہمی فرقہ وارانہ کشمکش جاری تھی اور مسلمان اقلیت باوجود مسلمان بادشاہوں کے ہندو اکثریت سے پامال ہوتی رہی یہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۱۲۳ پر درج ہے۔

"اس انحطاط کے اسباب یہ ہیں (۱) مسلم تہذیب کا ہندو تہذیب کے ساتھ عام میل جول (۲) وہ قدرتی موانست جو اس میل جول کے باعث ان تہذیبوں میں پیدا ہوگئی۔ اور (۳) یہ حقیقت کہ اسلام کو اپنے پیرؤں کی کثیر تعداد ہندو دھرم سے لینی پڑی جو اپنے ساتھ ہندو تہذیب کے کچھ عناصر بھی لیتے آئے اور جنہیں اس امر کی اجازت تھی کہ وہ اپنے گذشتہ مذہب اور تہذیب کے ساتھ چند ایک ہندو رسومات کے ذریعے سے اپنے تعلقات کی یاد تازہ رکھیں۔ اگر یہ ضروری تھا کہ ملک میں ہر جگہ

ہندو آبادی کے ساتھ مسلمان آبادی شیر شکر ہوتی رہے تو اشاعت اسلام کے نقطہ خیال سے یہ بھی ضروری تھا کہ کسی محفوظ مقام پر ایک اسلامی مرکز کا قیام ہوتا جو معاشرتی اور سیاسی طور پر ملک کے تمام دوسرے حصوں سے الگ تھلگ رکھا جاتا۔ تاکہ وہ مرکز غیر تہذیب اور غیر مذہب کے تباہ کن اثرات سے قطعاً مامون رہتا۔ اس مرکز سے ہندوستان کے تمام حصوں میں اسلامی رجحانات کی نشوونما کا کام لیا جاتا۔ اور اسی مرکز سے کسی ہندو نواح میں گھرے ہوئے مسلم طبقہ میں تخریب کے آثار اور اس طبقہ کی اسلام سے علیحدگی اور بے تعلقی کا علاج کر لیا جاتا۔ حفظ امن اور مدافعت کے لحاظ سے ایسے مرکز کے قیام کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔

الحمدللہ! یہ آواز صوبہ پنجاب سے اٹھی ہے جہاں ابھی تک ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت یعنی مسلم لیگ کی کوئی شاخ قائم نہیں ہو سکی ....
...... اور جہاں کے مسلمان ارباب حل وعقد ابھی تک غیر مسلموں کے گوشہ چشم کے اشارے پر رقص کرنے میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ خدا کرے یہ تصنیف آنے والے دور کا پیش خیمہ ہو اور مصنف کے روشن دماغ نے جس مستقبل کی تصویر کھینچی ہے وہ جلد معرض وجود میں آجائے۔

نواب شاہنواز صاحب نے اس کتاب کی چار ہزار جلدوں کو مسلم عوام میں تقسیم کر کے ملت اسلامیہ کی ایک اچھی خدمت کی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں درج ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں پہلی پیشکش حاجی سر عبداللہ ہارون صاحب کی طرف سے ہوئی تھی۔ ہم سر عبداللہ ہارون صاحب کی خدمت میں گذارش کرینگے کہ وہ اسی پیشکش کو پورا کر کے کم از کم چار ہزار مزید کاپیاں اور طبع کرائیں۔ اور ان میں سے کم از کم دو ہزار اپنے مجوزہ مسلم لیگ وفد کی وساطت سے انگلستان کی پبلک میں تقسیم کرائیں۔ کیونکہ ہندوستان کے معاملات کا محاذ اب ہندوستان نہیں ہے بلکہ انگلستان کے گلی کوچے ہیں۔

اس کتاب کے مصنف عنقریب اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کرینگے۔

اللہ تعالےٰ اس ہونہار نوجوان کی عمر میں برکت اور ارادوں کو تکمیل عطا فرمائے کہ قوموں کی تاریخیں بدلتے ہیں اسی قسم کے دل و دماغ سامنے آیا کرتے ہیں۔

(للشیخ الفاضل)

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ

اس کتاب کے پہلے تین حصوں کا ذکر جنوری کے پرچہ میں کیا جاچکا ہے اب اس کا چوتھا حصہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ اس حصہ میں مصر اور مراکش کی دو نامور ہستیوں کا تذکرہ ہے۔ یعنی سعد زاغلول پاشا۔ جنہوں نے مصریوں کو متحد کر کے انہیں برطانیہ کے پنجۂ استبداد سے چھڑایا اور غازی محمد بن عبدالکریم۔ جنہوں نے آزادیٔ مراکش کے لئے اسپین سے کئی لڑائیاں کیں اور اسے متعدد شکستیں دیں۔ اس کے بعد فرانس اور اسپین کی متحدہ طاقت کے سامنے انہیں ہتھیار ڈالدینے پڑے اور جلا وطن کر دیئے گئے۔ اور اب اس قید کی زندگی میں فرانسیسیوں کے ہاتھوں دردناک مظالم کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن انکی بیقربانی رائیگاں نہیں گئی اور اہل مراکش میں دوبارہ بیداری کے آثار نمایا ہو رہے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی ان نامور ہستیوں کے حالات پڑھنے سے فی الواقعہ نگاہوں میں روشنی اور خون میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمان کے نزدیک قلت و کثرت کوئی شے نہیں وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس کتاب کو اپنے بچوں کو ضرور پڑھایئے۔ طباعت۔ کتابت عمدہ قیمت فی نسخہ ۸ ر ملنے کا پتہ۔ دائرہ ادبیہ۔ دریا گنج۔ دہلی۔

(محمد اقبال۔ متعلم جماعت ہفتم)

اسلامی معاشرت

نقش ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات واخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اس کے تمدّن ومعاشرت کے خط وخال۔ اس تعلیم وتہذیب۔ اس کے دنیائی معاملات۔ اپنوں اور بےگانوں سے اس کے تعلّقات۔ غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز واسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لیے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کرلیا جائے تو طلبا کے قلب ودماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ر۔ محصول ار +

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوعِ اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع - زیادہ سے زیادہ - دس تاریخ تک دیجئے - ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو - اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ رتاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی) کارڈ رکھ دیا جاتا ہے - جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے - اور قیمت فی پرچہ (۸ر) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجئے۔ ہیں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی - پی - طلب کرنے کے بعد اُسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جُرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے - نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمایئے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں - اس لیے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیئے - ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا - کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "**طلوعِ اسلام**" کوئی تجارتی ادارہ نہیں - بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لیے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت **خدا** کو اپنے درمیان رکھیں - واللّٰہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کیلئے ۴ر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم
ادارہ طلوعِ اسلام
دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office, Delhi